اونچے درختوں کا باغ

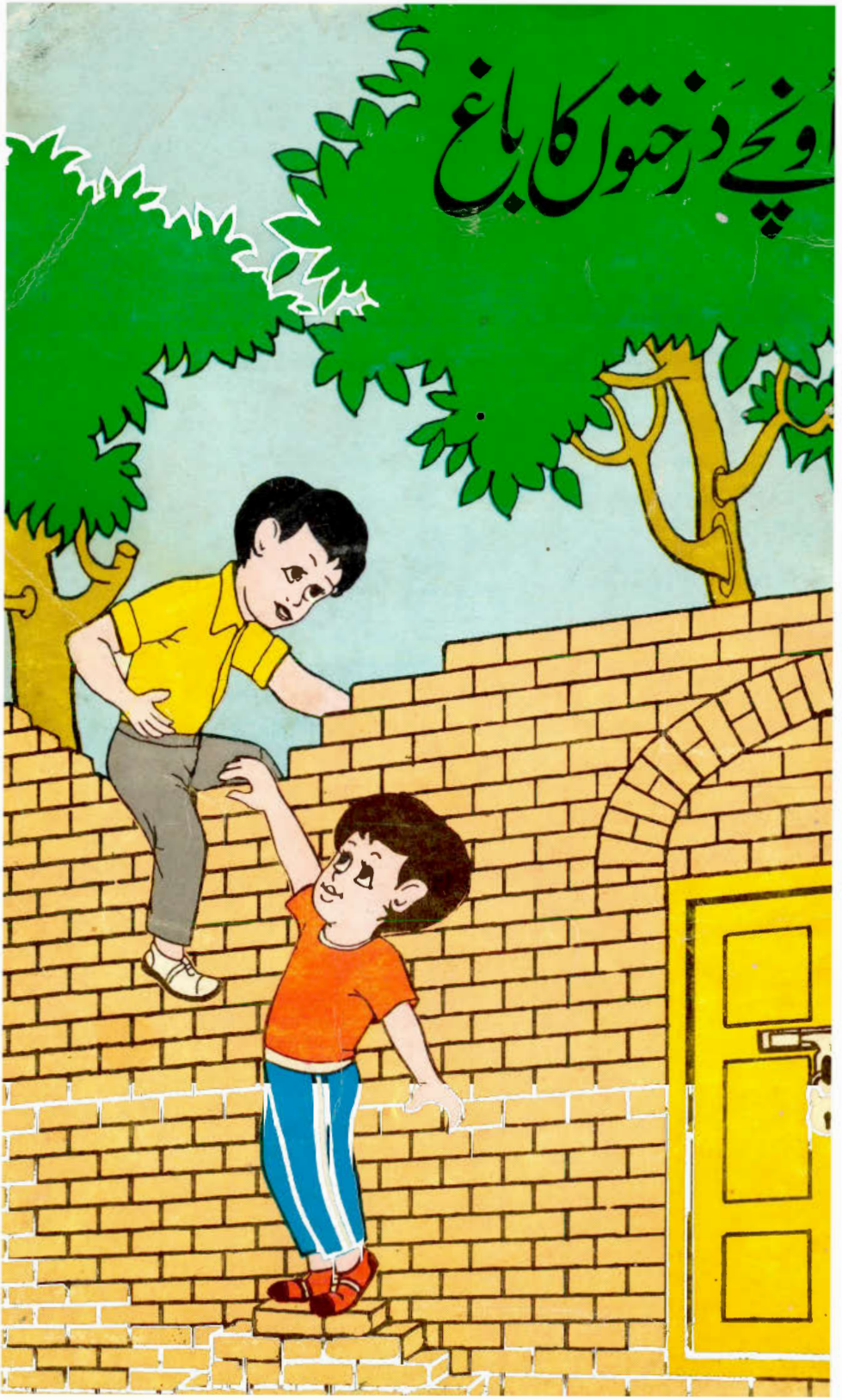

614546

نویں دسویں جماعت کے بچوں کیلئے

اونچے درختوں کا باغ

- منگو ڈاکو
- سائیکل
- کفارہ
- قدرت کا انتقام

دعوة اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

مطبوعات نمبر ۱۱۸

ادارت ونظرثانی: محمد افتخار کھوکھر، محمد شاہد رفیع
پبلیشر: دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد
مطبع: مارشل پرنٹنگ پریس راولپنڈی
ٹائیٹل ڈیزائن: سید مبین الرحمٰن
طبع اوّل: ستمبر ۱۹۹۰ء
تعداد اشاعت: پانچ ہزار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اُصول ہمیں بتائے ہیں اِن میں ایک بڑا اہم اور بنیادی اُصول یہ ہے کہ لوگوں تک اِن کی استعداد اور سمجھ کے مُطابق اپنی بات پہنچاؤ۔ اس سنہرے اُصول کے مطابق دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد مختلف طبقہ ہائے زندگی سے وابستہ افراد تک اسلام کی بُنیادی تعلیمات پہنچانے کے لیے دعوتی و تبلیغی لٹریچر کی تیاری اور اشاعت میں مصروف ہے۔

"بچے جنت کے پھول ہیں" یہ قول جتنا خوبصورت ہے، اِسی قدر اِس کے معنی و مفہوم کے بے پناہ رنگ ذہن و قلب پر نقش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھول کسی بھی رنگ کا ہو، وہ پھول ہی کہلاتا ہے۔ اسی طرح بچہ جیسا بھی ہو ماں باپ کے لیے آنکھ کا تارا ہوتا ہے۔

ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر بچہ نیک اور ستھری فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

دعوۃ اکیڈمی نے اِسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے نئی نسل کی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تربیت کے لیے شعبہ بچوں کا ادب قائم کیا۔ اِس شعبہ کے تحت گزشتہ تین سال میں بچوں کے لیے لکھنے والے معروف ادیبوں کا دو روزہ سیمینار، نئے لکھنے والوں کی تربیت و رہنمائی کے لیے تین روزہ ورکشاپ، بچوں کے ماہانہ رسائل کا جائزہ، بچوں کے لیے دس کہانیوں کا دلچسپ سیٹ، اُردو زبان میں کہانیوں کے دو انعامی مقابلوں کے بعد اب علاقائی زبانوں سندھی اور پشتو میں کہانیوں کے انعامی مقابلوں کا اہتمام کیا ہے۔

کہانیوں کا زیرِ نظر مجموعہ اس توقع اور خواہش کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے کہ اِن کہانیوں کے مطالعہ سے کم سن قارئین کے سیرت و کردار میں خوشگوار تبدیلی کا آغاز ہو سکے گا۔

بچّوں کے لیے کہانیوں کی تیاری اور اشاعت کے سلسلہ میں ہم نے روایتی انداز کو ترک کر کے ہر عمر کے بچّوں کے لیے کہانیوں کا الگ الگ سلسلہ شروع کیا ہے ہمارے پیشِ نظر یہ ہے کہ چار مختلف مدارج یعنی پہلی سے تیسری جماعت، چوتھی پانچویں جماعت، چھٹی سے آٹھویں جماعت اور نویں، دسویں جماعت کے بچّوں کے لیے اِن کی ذہنی سطح اور مزاج کے مطابق کہانیاں شائع کی جائیں۔

اِس مقصد میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کا فیصلہ جہاں ہمارے نوعمر قاری کریں گے۔ وہیں ہمیں بچّوں کے والدین کی آراء کا بھی انتظار رہے گا کہ اُنہوں نے اس سلسلہ کو کس حد تک مفید پایا اور وہ اِس میں مزید کیا کیا تبدیلیاں تجویز کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی
ڈائریکٹر جنرل
دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

مرزا ادیب

اُونچے درختوں کا باغ

گرمیوں کے موسم میں جب تپش کی شدت سے لوگ گھبرا رہے ہوں۔ ایک صبح ٹھنڈی ہوا چلنے لگے۔ فضا میں بادل گھر کر آجائیں اور ہوا کے جھونکے جسم کو چھوئیں تو بڑا لطف آتا ہے۔ بچے، بوڑھے، جوان سب خوش ہو جاتے ہیں، خاص طور پر بچے تو خوشی سے ناچ اٹھتے ہیں۔ ان کی خوشی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ایسے سہانے موسم میں چھوٹے لڑکوں کے سکول بند ہو جاتے ہیں اور لڑکے یا تو باغوں کی طرف نکل جاتے ہیں یا گھروں میں اپنی ماؤں سے مزے مزے کے کھانے پکانے پر اصرار کرنے لگتے ہیں۔

ایک ایسی ہی سہانی صبح تھی۔ رحمت ہائی سکول کے طالب علموں نے "فائن ڈے، فائن ڈے" کا شور مچا دیا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ دن بڑا سہانا ہے، اس لئے آج سکول سے چھٹی ہو جائے تو مزہ آجائے۔

سکول کے استادوں نے ہمیشہ کی طرح آپس میں مشورہ کیا اور لڑکوں کو یہ خوشخبری سنا دی کہ آدھ گھنٹے تک سکول میں چھٹی ہو جائے گی۔ اتنا سننا تھا کہ لڑکے اپنے اپنے بستوں میں کتابیں، کاپیاں وغیرہ رکھنے لگے اور آٹھ بجے کا انتظار کرنے لگے۔

ادھر آٹھ بجے ادھر گھنٹی نے اعلان کر دیا کہ سب طالب علموں کو چھٹی ہو گئی ہے۔

لڑکوں نے بستے سنبھالے اور اچھلتے کودتے سکول کے کمروں سے نکلنے لگے۔ ان لڑکوں میں ارشاد اور امتیاز بھی تھے۔

دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے۔ سکول سے واپسی پر گھر کا کام اور پڑھائی کرنے کے بعد ایک ساتھ کھیلتے بھی تھے۔ ان میں بڑی محبت تھی۔ ایک دوسرے کے بغیر کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔

سکول سے چھٹی ہوئی تو دونوں نے سوچا کہ جلدی گھر جانے کے بجائے کسی خوبصورت باغ میں جا کر ڈیڑھ دو گھنٹے گزارے جائیں۔ نرم نرم، سبز سبز گھاس پر بیٹھ کر باتیں کی جائیں اور گھوما پھرا جائے۔

اب دونوں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جائیں تو کس باغ میں جائیں۔ سکول اور گھر سے کچھ دور یا زیادہ دور کئی باغ تھے اور ان سارے باغوں میں وہ ایک بار نہیں کئی بار جا چکے تھے۔ وہ کسی نئے باغ میں جانا چاہتے تھے۔ ارشاد نے اپنے دوست امتیاز کو اپنی یہ خواہش بتائی تو وہ بولا۔ میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔ پرانے باغوں میں جا کر کیا کریں گے۔ کسی ایسے باغ میں جانا چاہئے جہاں پہلے کبھی نہ گئے ہوں۔

امتیاز کو یاد آ گیا کہ ایک دفعہ وہ اپنے ابو کے ساتھ ہوائی اڈے سے گھر آ رہا تھا تو اس نے راستے میں ایک جگہ دیواروں کے پیچھے اونچے اونچے درخت دیکھے تھے۔ اور ان درختوں کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کے ارد گرد پھولوں سے بھرے ہوئے پودے بھی ہوں گے اور گھاس بھی۔ اس وقت تو اس کے ابو کو گھر جانے کی جلدی تھی، اس لئے وہ ان سے باغ کے اندر جانے کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکا مگر اس کے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ جب بھی موقعہ ملے گا وہ اس باغ کے اندر ضرور جائے گا۔

اس وقت امتیاز نے ارشاد سے اس باغ کا ذکر کیا تو وہ بول اٹھا۔

"ہم آج اسی باغ میں جاتے ہیں۔"

"جاتے تو یہیں مگر میں بھول گیا ہوں کہ ہوائی اڈے سے واپسی پر اسے دیکھا کہاں تھا۔" امتیاز کی بات سن کر ارشاد مایوس نہ ہوا اور کہنے لگا۔

"ڈھونڈ لیں گے۔ میں بھی کئی بار ہوائی اڈے پر جا چکا ہوں۔"

دونوں نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ اس باغ میں ضرور جائیں گے۔

سکول سے چھٹی ہو چکی تھی۔ گھر میں کوئی ضروری کام بھی نہیں تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایسے سہانے دن کو بیکار گزارنا دونوں ہی کو پسند نہ تھا۔ دونوں چلنے لگے۔

باغ تلاش کرنے میں انہیں دقت تو ضرور ہوئی مگر زیادہ نہیں۔ ایک جگہ دیواروں کے پیچھے لمبے لمبے درختوں کو دیکھ کر امتیاز چلایا۔

"ارے! یہی تو ہے وہ باغ"

"سچ"

"اور کیا۔ دیکھ لو یہ دیواریں اور اونچے اونچے درخت۔"

اب ان کی کوشش یہ تھی کہ دروازہ نظر آ جائے اور وہ اس کے ذریعے باغ میں داخل ہو جائیں۔

دروازہ نظر تو آ گیا مگر انہیں دیکھ کر افسوس ہوا کہ وہ مقفل تھا اور قفل بھی کوئی چھوٹا نہیں کافی بڑا لگا تھا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔ باغ میں کیسے جائیں۔" ارشاد نے مایوسی سے سوال کیا۔

"یاد آیا۔ میں پہلے بھی ادھر سے گزرا تھا تو تالا لگا ہوا تھا۔" امتیاز بولا۔

"امتیاز!" ارشاد نے کہا۔ "یہ باغ عام لوگوں کے لئے نہیں ہو گا، کسی ایک شخص کی ملکیت ہو گا۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔" امتیاز بولا۔

''اس سے یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص جب چاہے اس کا دروازہ کھول سکتا ہے اور جب جی چاہے اسے بند کر سکتا ہے۔'' ارشاد نے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ مگر ہم ایسے اچھے موسم میں باغ کے اندر ضرور جائیں گے''

دونوں باغ کے اندر جانے کا پکا ارادہ کر چکے تھے۔ وہ دیواروں کے ارد گرد گھومنے لگے کہ کہیں دیوار نیچی ہو یا کوئی اور دروازہ بھی ہو اور وہ کھلا ہو تو اندر چلے جائیں۔

ایک جگہ دیوار کا اوپری حصہ گر چکا تھا۔ اور وہ آسانی سے باغ میں داخل ہو سکتے تھے۔

انہوں نے اینٹیں جمع کر کے ایک چبوترہ سا بنایا۔ پہلے ارشاد اوپر چڑھا اور دیوار کے اوپر سے اس نے اندر چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد امتیاز کی باری تھی' اس نے بھی یہی کام کیا۔

باغ کے اندر جا کر وہ حیران رہ گئے۔ پودے بے شمار تھے مگر کسی پودے پر بھی کوئی کھلا ہوا پھول دکھائی نہیں دیتا تھا۔ گھاس بڑھ بھی چکی تھی اور زرد بھی پڑی تھی۔

''یار امتیاز یہ کیا ہے؟''

''میں کیا بتاؤں۔ اونچے اونچے درخت دیکھ کر تو میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ اس میں ہزاروں رنگا رنگ پھول ہوں گے۔ سبز سبز گھاس ہو گی۔ تتلیاں اڑ رہی ہوں گی مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''باغ تو ہے نہیں' بس ایک ویرانہ ہے''

''ہاں ایک ویرانہ ہے''

وہ باہر نکلنے کی سوچ رہے تھے کہ ایک گرجتی ہوئی آواز آئی۔

''کیا کہا' یہ ایک ویرانہ ہے؟''

دونوں نے دیکھا کہ ان کے قریب ایک بوڑھا شخص انہیں سخت غصے سے دیکھ رہا ہے لمبا قد' سر پر ترکی ٹوپی۔ آنکھوں پر عینک' کمر جھکی ہوئی۔ وہ ڈر گئے۔

''کیا یہ ویرانہ ہے؟''

''جی.....جی.....وہ.....'' امتیاز نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر دہشت اور خوف کی وجہ سے اس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ خوفناک بوڑھا دو قدم اور ان کے قریب آ گیا۔

''میرے خوبصورت باغ کو ویرانہ کہتے ہو۔ کون ہوتے ہو تم یہ کہنے والے۔ میں نے اتنے پیار سے' اتنی محبت سے یہ پودے لگوائے ہیں۔ دھوپ میں گھنٹوں محنت کی ہے۔ ان کی پوری پوری رکھوالی کی ہے۔ بولو کون ہو تم۔''

دونوں تھر تھر کانپ رہے تھے۔

''بولتے کیوں نہیں ہو؟''

''جی' سچ اس گستاخی کے لئے آپ سے معافی مانگتے ہیں۔'' امتیاز بولا۔

وہ بوڑھا خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا پھر منہ موڑ کر ادھر دیکھنے لگا۔

"کون ہو تم، کہاں سے آئے ہو۔"

"ہم سکول میں پڑھتے ہیں، آٹھویں جماعت میں۔"

بوڑھے نے سر ہلایا۔ "ادھر کیوں آئے ہو میرے باغ میں۔"

امتیاز خاموش رہا۔ ارشاد نے جواب دیا۔

"آج سکول میں چھٹی ہو گئی۔ جی چاہا کہ کسی بڑے اچھے سے باغ میں جا کر گھومیں پھریں۔ ہمیں بہت افسوس اور ندامت ہے کہ آپ کی اجازت کے بغیر یہاں آ گئے۔ ابھی چلے جاتے ہیں۔"

"اور آپ سے ایک بار پھر معافی مانگتے ہیں۔" امتیاز بولا۔

دونوں چلنے لگے۔

"کیا کہا ہے تم نے۔" وہ بوڑھا انہیں جاتے دیکھ کر بولا۔

"معافی مانگی ہے"

"میرے باغ کے متعلق کیا کہا ہے"

دونوں گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"کیا تم نے یہ نہیں کہا ہے کہ یہ ایک ویرانہ ہے۔"

وہ خاموش رہے۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اب کے اس کا لہجہ غضب ناک نہیں لگتا تھا۔ "تم نے بالکل درست کہا ہے۔ یہ ایک ویرانہ بن گیا ہے۔ افسوس، صد افسوس"

بوڑھے نے آہ بھری اور ایک پودے کے پاس بیٹھ گیا۔

"اس پودے میں سیاہ گلاب لگا تھا۔ لوگ دور دور سے آ کر اسے دیکھتے تھے۔"

ارشاد اور امتیاز کی گھبراہٹ اور خوف بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ وہ بوڑھے سے گفتگو کرنے لگے۔

"اچھا بابا جی"

"سیاہ گلاب صرف میرے باغ میں تھا۔ میں نے یہ پودا بڑی محنت سے لگایا تھا اور وہ پودے۔ وہ سامنے دیکھ رہے ہو نا۔ ان میں سرخ گلاب لگتا تھا۔ ان کی خوشبو باغ کے باہر دور دور تک پھیل جاتی تھی۔"

امتیاز اور ارشاد ان پودوں کو دیکھ رہے تھے جو بالکل سوکھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

"میں نے نہ جانے کہاں کہاں سے پھولوں کے بیج ڈھونڈ نکالے تھے، سب ادھر لے آیا تھا۔ جتنے عمدہ عمدہ اور خوبصورت پھولوں کے پودے میرے باغ میں تھے، سارے شہر کے کسی باغ میں بھی نہیں تھے۔ آؤ میرے ساتھ، اپنے باغ کے تمہیں اور پودے دکھاؤں۔"

"بوڑھا انہیں سارے باغ میں گھماتا رہا۔ وہ تھک گئے تھے مگر بوڑھا نہیں تھکا تھا۔

یکایک بادل برسنے لگے۔ سیاہ بادلوں کی وجہ سے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ وہ ایک چھتنار درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ بارش ہوتی رہی اور وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔

آخر بارش رک گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ بوڑھا اپنی جگہ پر نہیں تھا۔

"پتہ نہیں کہاں گیا ہے، شاید یہیں کہیں ہو گا۔" امتیاز نے جواب دیا۔

دونوں اس جگہ پہنچ گئے، جہاں دیوار کا اوپری حصہ گر پڑا تھا۔ دونوں نے جلدی جلدی اینٹیں جمع کر کے ایک ڈھیر لگایا۔ پہلے ارشاد اس ڈھیر پر چڑھ کر دیوار کی دوسری طرف کودا، پھر امتیاز بھی کود پڑا۔ اس کے پاؤں زمین پر لگے ہی تھے کہ ایک شخص بھاگا ہوا آیا اور اس نے ان کے ہاتھ پکڑ لئے۔

"کیا لینے گئے تھے باغ کے اندر؟"

"ہمارا جی چاہا تھا۔"

"جی چاہا تھا۔ کیوں جی چاہا تھا۔"

"ویسے ہی جی۔ ہم نے اس کے مالک سے معافی مانگ لی تھی۔"

"اس کے مالک سے۔ کون ہے وہ۔"

ارشاد نے امتیاز کو اشارہ سے کہا۔ "تم بتاؤ۔"

امتیاز کہنے لگا۔ "وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ سر پر ترکی ٹوپی تھی اور آنکھوں پر عینک۔"

"کیا کہا۔ سر پر ترکی ٹوپی۔"

"اور آنکھوں پر عینک۔ کوٹ سفید رنگ کا تھا۔ کمر جھکی ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا میں اس باغ کا مالک ہوں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو لڑکے۔" وہ شخص بڑی حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں جناب۔ انہوں نے ہمیں معاف کر دیا تھا، ہم سے باتیں کی تھیں، ہمیں بتایا تھا کہ انہوں نے کتنی محبت سے ایک ایک پودا لگایا تھا۔"

وہ آدمی خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا پھر بولا۔ "چلو میرے ساتھ۔"

ارشاد اور امتیاز ایک شاندار بنگلے میں صوفے پر بیٹھے تھے، وہاں اس آدمی کے علاوہ جس نے انہیں دیوار پھلانگتے ہوئے دیکھا تھا اور پکڑ کر لے آیا تھا، وہاں ایک اور آدمی بھی تھا جو کافی عمر کا لگتا تھا۔

"چچا جان! یہ لڑکے کیا کہہ رہے ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا" وہ آدمی کافی عمر والے آدمی سے کہنے لگا۔

"میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا ہے۔" چچا بولا۔

"کیا سمجھ میں آ گیا ہے۔"

"سلیم بیٹا! تمہارے باپ اور میرے بڑے بھائی کو اپنے باغ سے بیحد محبت تھی، اس نے ایک ایک پودا

بڑے پیار اور شوق سے لگایا تھا۔ اسے مرے ہوئے چالیس برس گزر چکے ہیں مگر اپنے باغ سے اس کی محبت نہیں مری، ابھی زندہ ہے۔ آج اپنے اجڑے ہوئے اور ویران باغ کو دیکھ کر اس کی روح کو کتنا صدمہ پہنچا ہے۔ یہ تم نہیں جان سکتے۔

اپنے چچا کے یہ الفاظ سن کر اس آدمی کے چہرے پر ندامت پھیل گئی۔

"آپ نے ٹھیک کہا ہے چچا جان۔ مجھے سخت شرمندگی ہے کہ اپنے ابا جان کے باغ کی طرف توجہ نہ کر سکا۔ اب ایسا نہیں ہو گا۔ میں باغ کی پوری پوری نگرانی کروں گا۔"

ارشاد اور امتیاز اس آدمی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے جسے اس شخص نے چچا جان کہا تھا۔

"بچو!" چچا بولا۔ "تم حیران ہو گئے ہو اور تمہیں حیران ہونا بھی چاہئے، جس بوڑھے کو آج تم نے باغ میں دیکھا ہے، اسے دنیا سے رخصت ہوئے پورے چالیس سال گزر گئے ہیں۔ یہ اس کا بیٹا ہے جو تمہیں باتیں سن کر تمہیں یہاں لے آیا تھا۔ شاید تم نے اصلی معاملہ سمجھ لیا ہے۔"

ارشاد اور امتیاز نے زبان سے کچھ نہ کہا مگر ان دونوں کے سر ہاں کہنے کے انداز میں ہلنے لگے۔

ایک گھنٹے کے بعد جب وہ اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے تو انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ باغ کا بوڑھا مالک ان کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ فلاں پودے پر کیسے پھول لگتے تھے اور فلاں پودے کے پھولوں کا رنگ کیسا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔

.....

نورالسحر انصاری

سائیکل

احسن، ربیعہ" سنعیہ، تینوں بہن بھائی آٹھویں، ساتویں اور چھٹی جماعت کے طالب علم تھے، ان کی امی ایک پرائمری سکول میں ٹیچر تھیں اور ان کے ابو ایک دفتر میں گیارہ سو روپے ماہوار کے ملازم تھے۔ ان کی محدود آمدنی سے گھر کے تمام اخراجات اور مکان کا کرایہ، غرض تمام ضروریات پوری ہو رہی تھیں۔ اس کے علاوہ احسن کی امی آڑے وقت کے لئے ہر ماہ کچھ پیسے بھی بچالیا کرتی تھیں تاکہ ضرورت پڑنے پر کسی سے مانگنا نہ پڑے۔ یہ خوش و خرم گھرانہ دین و دنیا کے کاموں میں مصروف تھا۔ پھر اچانک یوں ہوا کہ ایک روز احسن کے ابو اپنے دفتر سے واپس آرہے تھے کہ ان کی بس کی ایک ٹرک سے ٹکر ہو گئی، کئی افراد تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے اور بہت سے زخمیوں کے ساتھ احسن کے ابو کو بھی شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ احسن کی امی نے سکول سے پندرہ روز کی چھٹی لے لی اور احسن کے ابو کی دن رات کی پرواہ کئے بغیر خدمت کرنے لگیں ان کے علاج معالجے پر تمام جمع کی ہوئی رقم خرچ ہو گئی اور نوبت زیورات بیچنے کی آ گئی۔ لیکن احسن کی امی نے خدا کی مرضی کے آگے اف تک نہ کی اور تمام زیورات فروخت کر دیئے اور احسن کے ابو کے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی" لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی میں تو کوئی دخل دے نہیں سکتا، احسن کے ابو تمام علاج اور پوری توجہ کے باوجود صحت یاب نہ ہو سکے، اور طویل علاج معالجے کے باوجود اللہ کو پیارے ہو گئے۔ احسن کی امی پر احسن کے ابو کی جدائی کے غم کے ساتھ ساتھ گھر کی ذمہ داری کا بھی بوجھ آ پڑا، مکان کا کرایہ گھر کا خرچ اور بچوں کی تعلیم کا خرچ، غرض ڈھیر سارے مسائل ان کے سامنے تھے۔ وہ سکول کی ملازمت کے ساتھ ساتھ محلے والوں کے کپڑے بھی سینے لگیں اور اس طرح بڑی مشکل سے گھر کی گزر بسر ہوتی۔ احسن، ربیعہ، سنعیہ چونکہ سمجھ دار تھے۔ لہٰذا ان سے اپنی امی کا اتنا زیادہ کام کرنا دیکھا نہیں جاتا تھا" لہٰذا ربیعہ سنعیہ تو گھر کے کام کے ساتھ ساتھ سلائی میں بھی اپنی امی کا ہاتھ بٹانے لگیں اور احسن اس سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کوئی ایسا کام کرنا چاہئے جس سے کچھ پیسے بھی ہاتھ آئیں اور اس کی تعلیم کا بھی حرج نہ ہو۔ تعلیم کو وہ ہر صورت میں جاری رکھنا چاہتا تھا کیونکہ تعلیم کے بغیر نہ تو وہ بڑا افسر بن

سکتا تھا اور نہ ہی امی کے خواب پورے کر سکتا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اسے ایک ترکیب سمجھ میں آئی وہ سیدھا شاکر صاحب کے گھر گیا' شاکر صاحب احسن کے ابو کی زندگی میں ان کے گھر اخبار ڈالنے آتے تھے دروازے پر دستک دینے اور اندر آنے کی اجازت لینے کے بعد احسن نے شاکر صاحب سے پوچھا شاکر صاحب آپ جس شخص کے اخبار بانٹتے ہیں وہ صاحب آپ کو کتنے پیسے دیتے ہیں اور اس کام میں آپ کا کتنا وقت صرف ہوتا ہے شاکر صاحب نے احسن کو بتایا کہ میں سو گھروں میں اخبار ڈالتا ہوں اور مجھے اس کا معاوضہ بھی سو روپے ملتا ہے بس یوں سمجھو گھر سے آنے اور جانے میں وقت لگتا ہے۔ اخبار بانٹنے کے لئے تو چودھری صاحب سائیکل دیتے ہیں سائیکل کا نام سنتے ہی احسن نے فوراً شاکر سے کہا شاکر صاحب کیا یہ ملازمت مجھے بھی مل سکتی ہے۔ شاکر صاحب نے کہا کیوں نہیں تم ایسا کرو کل نماز فجر کے بعد میرے ساتھ ہی چلو میں تمہیں چودھری صاحب سے ملوا دوں گا وہ اگر چاہیں گے تو تم کو رکھ لیں گے۔ مگر تمہیں سائیکل چلانی بھی آتی ہے؟۔ شاکر صاحب میں اپنے دوست کی سائیکل پر اکثر اپنا شوق پورا کرتا رہتا ہوں اب تو مجھے بڑی اچھی سائیکل چلانی آ گئی ہے۔ "بس پھر تو ٹھیک ہے کل فجر کے بعد میرے گھر آ جانا۔ "شاکر صاحب نے کہا۔ احسن خدا حافظ کہہ کر خوشی خوشی گھر آیا۔ اس نے اس بات کا ذکر اپنی امی سے نہیں کیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ امی اس کے فیصلے سے خوش نہیں ہوں گی' اس نے سوچا نوکری مل گئی تو بعد میں امی کو منا لوں گا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد احسن نے سکول کا کام کیا اور سونے کے لئے لیٹ گیا' صبح حسب معمول احسن کی امی نے اسے فجر کی نماز کے لئے اٹھایا تو وہ ایک ہی آواز پر اٹھ بیٹھا اور جلدی سے مسجد کے لیے چلدیا اور چلتے چلتے اس نے اپنی امی سے کہا کہ آج میں ذرا دیر سے گھر آؤں گا مجھے شاکر صاحب سے کچھ کام ہے' ان کی طرف جاؤں گا۔ لہٰذا آپ فکر نہ کیجئے گا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد وہ سیدھا شاکر صاحب کے گھر گیا۔ شاکر صاحب احسن کے منتظر تھے۔ احسن اور شاکر چودھری نیوز ایجنسی پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چودھری صاحب ایک ہاکر کو روز روز ناغہ کرنے پر ڈانٹ رہے ہیں اور یہ ڈانٹ آخر کار ہاکر کی چھٹی پر ہی ختم ہوئی۔ شاکر نے احسن سے سرگوشی کے انداز میں کہا' لو بھائی تمہارا کام بن گیا یہ کہتے ہوئے شاکر نے احسن کا چودھری صاحب سے تعارف کرایا اور ساری بات چودھری صاحب کو بتا دی' چودھری صاحب کو تو ہاکر کی ضرورت تھی ہی' انہوں نے فوراً حامی بھر لی اور اس ہاکر سے کہا احسن کو دو تین دن تک وہ گھر دکھا دو' جہاں اسے اخبارات بانٹنے جانا ہو گا۔ تب تمہیں تمہارے پیسے ملیں گے۔ ہاکر نے احسن کو وہ تمام گھر دکھائے۔ احسن تمام اخبار ڈالنے کے بعد گھر پہنچا تو اس کی امی نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو احسن نے ساری بات بتا دی' احسن کی امی نے احسن کی ملازمت کا سنتے ہی سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا جب تمہاری تمام ضروریات پوری ہو رہی ہیں تو کیا ضرورت ہے اس ملازمت کی۔ اس سے سکول کو دیر ہو جایا کرے گی۔ نہیں امی میں کوشش کروں گا کہ سکول کو دیر نہ ہو' اور اب آپ بھی سلائی کے کپڑے کچھ کم کر دیں۔ اس سے آپ کی صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے' میرے اگر ایک گھنٹے کے کام سے سو روپے مل جاتے ہیں تو کوئی بری بات نہیں' بس میں یہ ملازمت ضرور کروں گا۔ احسن نے فیصلے سناتے ہوئے کہا۔ احسن کی امی بیٹے کی ضد کے آگے خاموش ہو گئیں اور یوں احسن روزانہ اخبار ڈالنے

جانے لگا۔ پہلی تنخواہ ملی تو وہ خوشی خوشی گھر میں داخل ہوا اور سو روپے امی کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے بولا! امی لیجئے میری پہلی تنخواہ! احسن کی امی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھی آئے اور وہ رنجیدہ بھی ہو گئیں کہ کھیلنے کودنے کی عمر میں اس بچے کو گھر کی ذمہ داری کا احساس کرنا پڑ گیا ہے۔ انہوں نے بیٹے کو پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا بیٹے تمہیں سائیکل کا بہت شوق ہے نا' ایسا کرو ان پیسوں کو کسی محفوظ جگہ پر جمع کرتے رہو جونہی پیسے جمع ہو جائیں تم سائیکل خرید لینا' ہاں اتنا ضرور کرو ان پیسوں میں سے جتنا تمہارا دل چاہے ہر ماہ چھوٹی بہنوں کو کچھ جیب خرچ دے دیا کرو۔

نہیں امی سائیکل' اللہ نے چاہا تو پھر لے لیں گے' آپ کپڑے سینا کم کر دیں۔ احسن نے اپنی امی کی تکلیف کا سوچتے ہوئے کہا۔ احسن کی امی نے کہا' دیکھو بیٹا یہ ملازمت کرنا تمہاری ضد تھی ہم نے مان لی۔ اب یہ ہماری خواہش ہے لہٰذا تمہیں بھی ہماری بات ماننا ہو گی۔ چلیں ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی' یہ کہتے ہوئے احسن نے ربیعہ اور سنعیہ کو آواز دی دونوں بہنیں دوڑی ہوئی آئیں اور کہا "جی بھیا' آپ نے ہمیں بلایا ہے؟ احسن نے دونوں بہنوں کو پندرہ پندرہ روپے دیتے ہوئے کہا یہ لو بھئی تمہارا جیب خرچ' اب میں انشاءاللہ ہر ماہ تمہیں جیب خرچ دیا کروں گا۔ "شکریہ بھیا" دونوں نے بھرپور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ احسن کی آنکھیں خوشی سے چھلک پڑیں۔ احسن کی امی نے بے ساختہ احسن کو گلے لگا لیا۔ ربیعہ سنعیہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں۔ لیکن احسن گہری سوچ میں غرق تھا۔ اس نے سوچا وہ بیس روپے اپنے جیب خرچ کے لئے رکھے گا اور ہر ماہ باقاعدگی سے 50 روپے جمع کرے گا تاکہ جلد از جلد سائیکل خریدی جا سکے اور سکول جانے اور سودا سلف لانے میں بسوں کے کرائے سے نجات ملے۔ احسن اپنے جیب خرچ میں سے کاپی پنسل اور اس طرح کی چھوٹی موٹی ضرورت خود پوری کرنے لگا۔ اور اس کے علاوہ کبھی کبھار گھر کے لئے کوئی پھل وغیرہ بھی لے آتا اور اس کے ساتھ ساتھ پچاس روپے باقاعدگی سے جمع کرتے ہوئے اب اس کے پاس تین سو روپے ہو گئے تھے میرے خدا اب بھی سات سو روپے جمع کرنے ہیں شاکر صاحب کہہ رہے تھے سائیکل کم از کم ایک ہزار روپے کی آتی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں' احسن نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا احسن کی سائیکل خریدنے کی خواہش بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ سائیکل نہ ہونے کی وجہ سے اسے سودا سلف لانے' نیوز ایجنسی جانے اور وقت پر سکول پہنچنے میں کافی دشواری ہوتی تھی۔ گھر سے نیوز ایجنسی پہنچنے میں اس کا آدھ گھنٹہ صرف ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ کبھی احسن کو نیوز ایجنسی کے مالک کی ڈانٹ سننی پڑتی تو کبھی سکول دیر سے پہنچنے پر سزا ملتی۔ مگر وہ سب کچھ اس لئے برداشت کر رہا تھا کہ اسے اس کی امی نے بتایا تھا کہ خدا اس شخص کو ضرور آزماتا ہے جو خدا کو پیارا ہوتا ہے۔ احسن کے لئے یہ سب کچھ آزمائش ہی تھی لہٰذا وہ تمام تکلیفوں کو بھول کر خوشی خوشی روزمرہ کے کام سرانجام دیتا۔ وقت یونہی گزرتا جا رہا تھا کہ ایک دن احسن کی امی نے احسن سے کہا بیٹا عبدالمجید صاحب کی بیگم آئی تھیں کہہ رہی تھیں کہ ان کے ہاں ہر جمعرات کی شام کو عصر کی نماز کے بعد درس قرآن پاک ہوتا ہے" آپ بھی احسن کو بھیج دیا کیجئے۔ تو بیٹے آج شام عصر کی نماز کے بعد تم سیدھے درس قرآن پاک میں چلے جانا اور ہاں وقت کی پابندی کا

خیال رکھنا ورنہ دیر سے پہنچنے کی صورت میں تم درس کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاؤ گے۔ شام ہوتے ہی احسن عبدالمجید صاحب کے ہاں پہنچا سلام اور تعارف کے بعد خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ کر درس سننے لگا۔

آج کے درس کا موضوع "دعا" تھا۔ دعا کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا گیا کہ انسان کو اپنی معمولی سے معمولی چیز کے لئے بھی خدا سے دعا کرنی چاہئے۔ دعا کی قبولیت میں دیر کو یہ ہرگز نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوئی اور ہمیں ہماری مطلوبہ چیز نہیں ملی لہٰذا دعا ہی مانگنا چھوڑ دیں۔ اللہ دعائیں ضرور قبول کرتے ہیں یا تو بندے کو وہ چیز دے دیتے ہیں جو وہ مانگ رہا ہوتا ہے یا پھر آنے والی مصیبتیں ٹال دیتے ہیں' یا پھر آخرت میں وہ دعا کام آتی ہے لہٰذا وسائل کی پرواہ کئے بغیر ہمیں اللہ تعالیٰ سے اپنی ضروریات کے لئے دعا مانگنی چاہئے دل سے نکلی ہوئی دعا پر خدا غیب سے مدد بھیجتا ہے۔ درس کے اختتام پر عبدالحمید صاحب نے کہا اب آپ میں اگر کوئی سوال کرنا چاہے تو میں جواب کے لئے حاضر ہوں۔ احسن تو جیسے اس کا منتظر ہی تھا اس نے فوراً سوال کیا! غیب سے مدد کیسے آتی ہے؟ عبدالحمید صاحب نے کہا آپ نے بہت اچھا سوال کیا میں آپ کو بتاتا ہوں غیب سے مدد کیسے آتی ہے۔ دیکھیں مثال کے طور پر آپ کو کسی چیز کی شدید ضرورت ہے اور آپ کے پاس اسے خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہیں تو آپ خدا سے یوں دعا کریں کہ اے میرے رب اگر تو بہتر سمجھتا ہے تو یہ چیز مجھے عنایت فرما ہو سکتا ہے آپ کی دعا کرتے وقت رحمت الٰہی کو جوش آجائے اور آپ کے کوئی عزیز' ماموں' چچا یا کوئی رشتہ دار جو کسی دوسرے ملک یا دوسرے شہر میں رہتے ہوں آپ سے ملنے آئیں اور تحفے میں وہی چیز آپ کو دیں جس کے لئے آپ نے خدا سے دعا کی ہو تو سمجھ لیں کہ یہ غیب سے مدد آئی ہے لیکن دعا میں جلدی نہیں کرنی چاہئے یہ خدا کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ دعا کے الفاظ ختم ہوتے ہی دعا قبول کرے یا پھر مہینہ سال یا کئی سال بعد آپ کی وہ خواہش پوری کر دے جس کے لئے آپ مسلسل دعا مانگ رہے ہوں یہ بات نا صرف احسن کی سمجھ میں آگئی بلکہ اسے بہت اچھی لگی درس کے اختتام پر دعا مانگی گئی۔ احسن نے گڑگڑا کر سائیکل کے لئے دعا مانگی اور واپس آکر دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے لگا' کھیل ہی کھیل میں مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد جونہی احسن کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے اسے فوراً وہ الفاظ یاد آگئے کہ دل سے نکلی ہوئی بات پر خدا غیب سے مدد بھیجتا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر خدا سے دعا مانگی اے میرے رب تو جانتا ہے کہ میرے کوئی چچا ماموں یا قریبی رشتہ دار نہیں ہیں اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ سائیکل کی مجھے کتنی ضرورت ہے اس کے نہ ہونے سے مجھے اکثر چودھری صاحب اور ماسٹر صاحب کی ڈانٹ پڑتی ہے' یا اللہ مجھے ڈانٹ سے بچالے اور میری غیب سے مدد کرتے ہوئے مجھے سائیکل دلا دے اس دعا کو بار بار دہراتے ہوئے احسن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس نے آمین کہتے ہوئے کلمہ پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیر لئے اور گھر آگیا۔ کھانا کھانے' ہوم ورک کرنے اور عشاء کی نماز ادا کرنے بعد وہ سونے کے لئے لیٹ گیا۔ بستر پر لیٹا ہوا احسن سوچ رہا تھا کہ میری دعا ضرور قبول ہو گی کیونکہ درس میں بتایا گیا ہے کہ دل سے نکلی ہوئی دعا پر اللہ تعالیٰ غیب سے مدد بھیجتے ہیں' اس لئے اب غیب سے مدد آنے والی ہے۔ احسن نے پر امید ہو کر دعا مانگنی شروع کی اور دعا مانگتے مانگتے سو گیا۔ وقت گزرتا گیا احسن دعا کے ساتھ ساتھ سائیکل خریدنے کے لئے پیسے

بھی جمع کرتا رہا۔ اب اس کے پاس پانچ سو روپے جمع ہو گئے تھے۔ ایک دن جب احسن سکول سے گھر واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ گلی میں کچھ لوگ فضل کریم کے گھر کے سامنے جمع ہیں اس نے گھر آکر اپنی امی کو بتایا احسن کی امی نے کہا تم کھانا کھاؤ' میں معلوم کر کے آتی ہوں احسن کی امی فضل کریم کے گھر پہنچیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ چارپائی پر فضل کریم خون میں لت پت بیہوشی کی حالت میں پڑا ہے اور اس کی بیوی اور تینوں بیٹیاں بیٹھی رو رہی ہیں۔ احسن کی امی کے پوچھنے پر فضل کریم کی بیوی نے روتے ہوئے بتایا کہ فضل کریم آج کل ایک عمارت کے کام میں مزدوری کر رہا تھا۔ آج وہ جب تیسری منزل پر مستری کو اینٹیں دینے جا رہا تھا تو اس کا پیر پھسل گیا اور وہ سڑک پر آگرا۔ سڑک پر بھی اینٹیں پڑی ہوئی تھیں بلندی پر سے گرنے کی وجہ سے اس کا سر پھٹ گیا اور جسم پر جگہ جگہ چوٹیں آئی ہیں' ایک ٹانگ کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی ہے۔ احسن کی امی نے انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا صبر کرو بہن خدا اپنے نیک بندوں ہی کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔ ابھی احسن کی امی دلاسہ دے ہی رہیں تھیں کہ محلے کے لوگ فضل کریم کو ہسپتال لے جانے کے لئے آگئے۔ احسن کی امی اجازت لے کر گھر آگئیں انہوں نے ربیعہ سنیعہ اور احسن کو تمام باتیں بتاتے ہوئے کہا' "احسن بیٹے میں تو فضل کریم کی بیوی سے فضل کریم کی طبیعت کا پوچھ آئی ہوں اب تم فضل کریم کے ہوش آنے پر ہسپتال جا کر عیادت کر آنا احسن کی امی اور محلے کے خدا ترس لوگوں نے حسب توفیق فضل کریم کی دوائیوں اور دیگر اخراجات کے لئے اس کی بیوی کو پیسے دیئے اور یوں فضل کریم کا علاج ہوتا رہا لیکن اب فضل کریم کی ٹانگ کے آپریشن کی باری تھی فضل کریم کی بیوی کو تمام محلے والوں نے اور احسن کی امی نے جتنے پیسے دیئے ان سب کو ملا کر بھی آپریشن کے لئے رقم جمع نہیں ہوئی تو احسن کا خیال اپنے ان پانچ سو روپے کی طرف گیا۔ جو اس نے بڑی محنت سے اپنی سائیکل کی خریداری کے لئے جمع کئے تھے' یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا ایک طرف تو احسن کا سائیکل کا پورا ہوتا ہوا شوق تھا اور دوسری طرف فضل کریم کی زندگی۔ احسن نے سوچا اگر خدانخواستہ فضل کریم مر جاتے ہیں تو ان کی بیوی اور بیٹیاں کیا کام کریں گی وہ تو ہماری امی کی طرح پڑھی لکھی بھی نہیں ہیں جو کسی سکول میں ملازمت کر کے گھر کا گزر بسر کر سکیں۔ انہیں اندیشوں نے احسن کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ چاہے سائیکل آئے یا نہ آئے میں اپنے جمع کئے ہوئے پیسے فضل کریم کے علاج کے لئے دے دوں گا۔ احسن نے ساری بات اپنی امی کو بتائی احسن کی امی نے احسن کے اس نیک جذبے کی تعریف کرتے ہوئے کہا' ٹھیک ہے بیٹے دے دو پیسے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ہم کسی کی مدد کریں گے تو اللہ ہماری مدد کریں گے۔ احسن کے فیصلے کو امی کی حمایت ملی تو احسن نے پانچ سو روپے امی کو دیتے ہوئے کہا مجھے شام کو درس قرآن پاک میں جانا ہے آپ فضل کریم کی بیوی کو دے آیئے گا۔ احسن نے فضل کریم کے علاج کے لئے پانچ سو روپے تو دیئے لیکن اسے اس بات کا احساس کھائے جا رہا تھا کہ اب اسے پھر اتنی ہی رقم از سر نو جمع کرنی پڑے گی' اس کے لہجے میں اللہ تعالیٰ کے لئے شکوہ تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا میرے اللہ غیب سے مدد کب آئے گی' کب مجھے سائیکل ملے گی' کب میں روز روز کی ڈانٹ سے بچوں گا' میرے لئے غیب سے مدد بھیج۔ اب احسن کا دل نہ کھانے میں نہ پڑھنے میں نہ نماز میں کسی بھی چیز میں بھی تو نہیں لگ رہا تھا۔ رات کو جب وہ تھکا

ہوا بستر پر سونے کے لئے لیٹا تو نیند بھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اس کی امی اور بہنیں گہری نیند سو چکی تھیں' احسن پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اس نے دعا کرتے ہوئے کہا میرے اللہ غیب سے مدد بھیج دے مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے وہ تمام رات رو رو کر سائیکل کے لئے دعا مانگتا رہا یہاں تک کہ رات کے دو بجے اس کی امی کے تہجد پڑھنے کا وقت ہو گیا تو اس نے جلدی سے آنسوؤں سے بھیگا ہوا تکیہ پلٹ کر کروٹ بدلی اور سونے کی کوشش کرنے لگا اور آخر کار اسے نیند آ گئی۔ صبح حسب معمول احسن کی امی نے جب احسن ربیعہ اور سنیعہ کو نماز کے لئے اٹھایا تو احسن نے امی اور بہنوں سے کہا آج رات میں نے بڑا اچھا خواب دیکھا ہے احسن نے خواب سناتے ہوئے کہا میں نے دیکھا کہ ہمارے بر آمدے میں ایک بالکل نئی سائیکل کھڑی ہے اور میں اسے صاف کر کے اور زیادہ چمکا رہا ہوں۔ احسن کی امی نے خواب سننے کے بعد کہا ہو سکتا ہے بیٹے یہ تمہارا خواب سچا ہو کیوں کہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک قسم کے خواب رویائے صالحہ کہلاتے ہیں۔ رویائے صالحہ وہ خواب ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں یہ خواب سچے اور اچھے یعنی حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ احسن نے اپنی امی سے خوابوں کے متعلق سنا تو جلدی جلدی سے دعا مانگنے لگا۔ یا اللہ میرا یہ خواب رویائے صالحہ میں سے ہو اس خوبصورت خواب کو سوچ کر خوش ہوتے ہوئے وہ جلدی جلدی ادائیگی نماز کے لئے مسجد گیا۔ گھروں میں اخبار ڈالے اور سکول چلا گیا۔ اردو کے ٹیچر نے کلاس میں آ کر بتایا کہ ہمارے ضلع کے تمام سکولوں کے درمیان ایک تقریری مقابلہ ''عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی'' کے عنوان سے ہو رہا ہے جو لڑکا حصہ لینا چاہے وہ اپنا نام لکھوا دے۔ احسن نے بھی اپنا نام لکھوا دیا۔ گھر آ کر اس نے امی سے تقریر لکھوائی اور اسے یاد کرنا شروع کر دیا۔ آج اس کے سکول میں تمام لڑکوں میں سب سے بہترین تقریر کرنے والے لڑکے کے چناؤ کا دن تھا۔ احسن نے بھی پوری تیاری کی ہوئی تھی۔ ٹیچر نے تمام لڑکوں سے باری باری تقاریر سنی اور آخر کار احسن کو اس کے سکول کی طرف سے نمائندگی کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ احسن بہت خوش تھا کہ کل اسے ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں جانا ہے۔ اس کی دعا تھی کہ اپنے سکول کی طرح وہاں بھی وہ تمام سکولوں کے بچوں پر سبقت لے جائے اور اسے پہلا انعام ملے۔ احسن نے رات ہی کو اپنا یونیفارم نکال کر استری کر کے لٹکا دیا' جوتے پالش کر لئے اور صبح ہوتے ہی اپنے تمام کام نمٹا کر وہ جلدی سے سکول پہنچا اور ایک دفعہ سر کو تقریر سنائی اور پھر دوسرے ٹیچرز کے ساتھ ڈسٹرکٹ کونسل ہال کے لئے روانہ ہو گیا۔ ہال میں کافی سکولوں کے بچے آ چکے تھے اور بہت سے آ رہے تھے۔ جشن کا سا سماں تھا۔ آج کے تقریری مقابلے کے مہمان خصوصی ڈپٹی کمشنر صاحب تھے۔ تقریری مقابلے کا آغاز کلام پاک سے ہوا' اس کے بعد باری باری تمام سکولوں کے نمائندہ بچوں نے تقاریر کیں۔ تقاریر کے اختتام پر احسن بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ دیکھیں کون سا لڑکا پہلے انعام کا حقدار ہوتا ہے اور ساتھ ہی اپنے اول آنے کی دعائیں مانگ رہا تھا کہ اعلان کیا گیا کہ جج صاحبان کے فیصلے کے مطابق یہ تین بچے پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر آئے ہیں۔ ان تینوں بچوں میں احسن نام بھی تھا۔ احسن کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور اب وہ فرط جذبات سے جیسے اس کا دل دھڑکنا بھی بھول

گیا کہ پورے ضلع میں اول نمبر پر آنے والے بچے احسن نظیر کو تالیوں کی گونج میں انعام لینے کے لئے بلایا گیا۔ احسن تالیوں کی گونج میں اپنا انعام لے کر آیا ہی تھا کہ ڈپٹی کمشنر صاحب نے احسن کی تقریر کے خوبصورت انداز اور ٹھوس دلائل سے متاثر ہوتے ہوئے پانچ سو روپے نقد انعام کا اعلان کیا۔ احسن اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر کے کہنے لگا۔ عبدالمجید صاحب سچ کہتے تھے کہ دل سے نکلی ہوئی دعا پر اللہ تعالیٰ غیب سے مدد بھیجتے ہیں، ابھی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹا بھی نہ تھا کہ ڈھائی سو روپے کا اعلان ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف سے ہوا۔ احسن نے ڈھائی سو اور پانچ سو روپے کو جمع کرتے ہوئے کہا "ساڑھے سات سو خدایا تیرا شکر ہے سائیکل خریدنے کے لئے کافی پیسے ہو گئے ہیں" احسن خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا کہ ہال میں بیٹھے ہوئے ایک اور شخص نے ڈھائی سو روپے احسن کو دینے کا اعلان کیا۔ پورے ایک ہزار روپے، احسن نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ تو نے واقعی غیب سے میری مدد کی ہے تقریب اختتام کو پہنچی احسن انعامی کپ اور ایک ہزار روپے لے کر خوشی خوشی گھر آیا۔ اپنی امی اور بہنوں کو سارا واقعہ سناتے ہوئے کہا اللہ تعالیٰ نے واقعی میرے لئے غیب سے مدد بھیجی ہے، اور اب میرے پاس اتنے پیسے ہو گئے ہیں کہ میں ایک سائیکل خرید سکتا ہوں اس کی امی نے احسن کو گلے لگا لیا اور اس کا ماتھا چوم لیا۔

محبوب الٰہی مخمور

کفارہ

رضوان آج اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا۔ کیونکہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ آج کامیاب ڈاکہ ڈالا تھا اور کافی مال اور زیورات وغیرہ اس کے ہاتھ آئے تھے اسی خوشی میں اس نے اپنے ساتھیوں میں کافی مال تقسیم کر دیا تھا اور پہاڑوں کے غاروں میں جشن کا سا سماں تھا۔ رضوان اسی خوشی میں قہقہہ لگا رہا تھا اس کے ساتھی بھی خوشی میں جھوم رہے تھے۔

رضوان ایک متوسط اور خوشحال گھرانے کا فرد تھا۔ جس سے اس کے والدین بے انتہا محبت کرتے تھے اور اس کی ہر فرمائش جوان کے اختیار میں ہوتی تھی پوری کرتے تھے۔ میٹرک تک اس نے تعلیم پر مکمل توجہ دی اس کے والد جمیل صاحب ایک ماہر ڈاکٹر تھے۔ اور ان لوگوں کا گزر بہت اچھی طرح ہو رہا تھا۔ ان کی یہ دلی تمنا تھی کہ رضوان بھی ڈاکٹر بنے اور سسکتی ہوئی انسانیت کی خدمت کرے کیونکہ وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی دولت کی ہوس کو دیکھ رہے تھے جہاں ہر کام پیسے کے لئے ہو رہا تھا۔ لوگ اپنا ضمیر تک اسی پیسے کی خاطر فروخت کر رہے تھے۔ ڈاکٹروں کی ایک بڑی تعداد دولت بٹورنے کے لئے مریضوں کی کھال اتار رہی تھی۔ وہ رضوان کو ایک ایسا مسیحا دیکھنا چاہتے تھے جو کہ علم کو قوم کی امانت سمجھے وہ کافی عرصہ سے یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ ایک ہسپتال قائم کریں جس میں مریضوں کا علاج مفت یا واجبی فیس پر ہو۔ جمیل صاحب نے اپنی بساط کے مطابق ایک چھوٹا سا ہسپتال بنا بھی لیا تھا۔ اب ان کی سب سے بڑی امید رضوان تھا۔ کیونکہ وہ بھی ڈاکٹر بن کر ان کے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا تھا۔

ڈاکٹر جمیل اپنے چھوٹے سے ہسپتال میں بیٹھے مریضوں کا معائنہ کر رہے تھے کہ رضوان دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ جمیل صاحب نے نظر اوپر اٹھائی تو سامنے رضوان کھڑا تھا۔

کیا بات ہے رضوان۔ جمیل صاحب نے کہا۔

اباجان میں ایک اطلاع دینے آیا ہوں۔ رضوان نے کہا۔

اطلاع کیسی اطلاع۔ جمیل صاحب نے پوچھا۔

اطلاع نہیں خوشخبری سنانے آیا ہوں۔ رضوان نے سسپنس پیدا کرتے ہوئے کہا۔

خوشخبری تو میں سمجھ گیا ہوں جو تم سنانے آئے ہو۔ جمیل صاحب نے کہا۔

یعنی آپ کو پہلے سے معلوم ہے۔ رضوان نے پوچھا۔

تم نے خوشخبری کہا تو میں سمجھ گیا کہ تمہارا رزلٹ آگیا ہے۔ جمیل صاحب نے کہا۔

جی ابا جان! رزلٹ آگیا ہے اور میں آپ کی دعاؤں سے اے گریڈ میں پاس ہو گیا ہوں۔ رضوان نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

تم نے اپنی امی کو بتا دیا ہے یا نہیں۔ جمیل صاحب نے پوچھا۔

ابھی جا کر بتاتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے رضوان کمرے سے باہر نکل گیا۔

دوپہر میں جمیل صاحب گھر آئے تو ان کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک بڑا سا ڈبہ تھا جو انہوں نے محلے میں تقسیم کروادی۔

تمہارا داخلہ کب ہو گا۔ بیگم جمیل نے کہا۔

تقریباً دو ماہ بعد۔ رضوان نے کہا۔

ایسا کرو کہ کچھ کتابیں ابھی سے خرید لو تاکہ دو ماہ تک گھر پر پڑھتے رہو تاکہ تم کو بعد میں مشکل نہ ہو۔ بیگم جمیل نے کہا۔

ابا جان! میں داخلہ کس کالج میں لوں۔ رضوان نے پوچھا۔

کسی بھی کالج میں داخلہ لے لو۔ جمیل صاحب نے کہا۔

کوئی اچھا کالج ہو تو بات ہے۔ رضوان نے کہا۔

اچھے سے تمہاری مراد کیا ہے؟ بیگم جمیل نے رضوان سے سوال کیا۔

جس کی پڑھائی زبردست ہو۔ رضوان نے کہا۔

کالج تمام اچھے ہوتے ہیں اور پڑھائی بھی ہر کالج کی عمدہ ہوتی ہے بشرطیکہ طالب علم خود محنت سے پڑھے اور اپنے مستقبل کو قوم کی امانت سمجھے۔ بیگم جمیل نے کہا۔

رضوان کالج میں داخل ہوا تو کالج کے ماحول میں آزادی سے اس نے غلط مطلب لیا۔ اس نے کالج کے اچھے دوستوں کے بجائے ایسے ساتھیوں کی صحبت اختیار کر لی۔ جو کہ پڑھائی کے بہانے رضوان کو سات ملا کر چوریاں کرتے تھے۔

دو دن بعد رضوان جیسے ہی کالج کے گیٹ سے داخل ہوا۔ اس کی نظر عاقل۔ لطیف۔ تاج اور قطب پر پڑی جو کنٹین کے دروازے پر کھڑے تھے۔ رضوان سیدھا ان کے پاس پہنچا اور یہ لوگ گھاس پر بیٹھ گئے۔

دو دن کہاں رہے۔ لطیف نے پوچھا۔

طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لئے نہیں آیا۔ رضوان نے جواب دیا۔

میں آج سکوٹر لے کر آیا ہوں۔ لطیف نے بتایا۔

سکوٹر لائے ہو میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے کہ سکوٹر پر دوپہر میں واردات کی جائے اس طرح کچھ مال بھی ہاتھ آجائے گا عاقل نے کہا۔

یار واقعی آئیڈیا تو برا نہیں ہے۔ تاج نے کہا۔

اس کام کے لئے دو لوگوں کا ہونا ضروری ہے۔ لطیف نے کہا۔

تمہارے ساتھ میں چلتا ہوں۔ قطب نے کہا۔

نہیں! رضوان میرے ساتھ صحیح رہے گا۔ لطیف نے کہا۔

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ رضوان نے کہا۔

تو پھر آج دوپہر میں چلیں گے تاکہ گلیاں سنسان ہوں۔ لطیف نے کہا۔

ٹھیک ہے جب تک گھوم پھر کر آتے ہیں۔ دو بجے واپس جمع ہوں گے۔ اور یہ لوگ آوارہ گردی کرنے نکل پڑے۔

دو بجے رضوان لطیف کے ساتھ سکوٹر پر سوار مختلف گلیوں میں شکار کی تلاش میں گھوم رہا تھا جبکہ اس کے دیگر دوست ایک ہوٹل میں بیٹھے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک گلی میں ان کو ایک آدمی ہاتھ میں بیگ لئے ہوئے نظر آیا۔ لطیف نے رضوان کو ہوشیار کیا اور تیزی سے سکوٹر اس کے برابر سے لے کر گزرا۔ اگلے ہی لمحے اس شخص کا بیگ رضوان کے ہاتھ میں تھا اور وہ آدمی چلاتا ہی رہ گیا اور یہ لوگ ہوا ہو گئے۔

تاج، قطب اور عاقل کچھ دیر بیٹھ کر اپنے اڈے کی طرف چلے گئے جو کہ ایک کمرے کی صورت میں تھا۔

تھوڑی دیر بعد رضوان اور لطیف کمرے میں داخل ہوئے۔

کیسا رہا دوستو! قطب نے پوچھا۔

کامیاب رہے ہیں۔ رضوان نے فخریہ انداز میں کہا۔

کیا ہاتھ آیا۔ تاج نے بے چینی سے پوچھا۔

ابھی بیگ کھول کر نہیں دیکھا ہے۔ تمہارے سامنے ہی چیک کرتے ہیں کہ اس میں کیا کچھ ہے۔ لطیف نے کہا۔

تمام چیزیں بیگ سے نکال کر زمین پر ڈال دیں۔ جس میں چند کاغذات، چابیاں اور ایک ہزار روپے تھے۔

کاغذات پھاڑ کر کوڑے میں ڈال دو اور چابیاں کونے میں رکھ دو کبھی کسی کا تالا کھولیں گے اور مال برابر تقسیم کر لو۔ رضوان نے کہا۔

یار یہ دھندہ تو بہت اچھا ہے کیوں نا اس کو ہی اپنا لیا جائے۔ عاقل نے کہا۔

ٹھیک ہے مگر ہر روز علیحدہ ٹیم ہوگی اور سکوٹر کی تین چار نمبر پلیٹیں بنوالو اور میں تو رضوان کے ساتھ ہی جایا کروں گا۔ لطیف نے کہا۔

ٹھیک ہے میں اور قطب ایک ساتھ جائیں گے تاج نے کہا۔

مال تو آج کافی مل گیا ہے چلو سینما چلتے ہیں شام کو موج اڑائیں گے۔ قطب نے کہا۔

فلم کے بعد کل جمع ہونے کا کہہ کر یہ لوگ چل دیئے دوسرے دن قطب اور تاج نے اپنی باری سنبھالی اور ایک عورت کا پرس لے کر رفوچکر ہو گئے جس میں زیورات اور چار سو روپے نکلے۔

اب یہ لوگ مختلف علاقوں میں روز لوگوں کو لوٹنے لگے۔

کئی دنوں کے بعد رضوان اور لطیف کی باری آئی۔ یہ لوگ خاموشی سے مختلف گلیوں میں گھومتے رہے ایک جگہ ایک راہگیر کے ہاتھ سے اس کا تھیلا رضوان نے چھینا اور لطیف نے سکوٹر کی رفتار تیز کر دی۔ یہ لوگ اپنی کامیابی پر خوش ایک گلی سے نکلے تو سامنے ایگل سکواڈ کی گاڑی کھڑی تھی جس پر پولیس والے نے پوزیشن لے رکھی تھی۔ سکوٹر کو روکنے کا اشارہ کیا۔ لطیف نے بحالت مجبوری سکوٹر روک لیا۔ دونوں کو تھانے لے جایا گیا یہاں وہ آدمی پہلے سے موجود تھا جس کا رضوان نے تھیلا چھینا تھا۔

ہم لوگوں کو کافی دنوں سے تمہاری تلاش تھی اور آج منصوبہ کے تحت تم کو پکڑا گیا ہے۔ انسپکٹر حبیب نے کہا۔

مگر ہم نے کیا جرم کیا ہے۔ رضوان نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

تم کو تصور بھی میں بتاؤں۔ یہ تھیلا تمہارے پاس کیسے آیا۔ انسپکٹر حبیب نے پوچھا۔

وہ..... یہ! ہمیں راستے میں ملا تھا۔ لطیف نے کہا۔

تمہاری کچھ خاطر تواضع ہو ہی جائے تاکہ تم لوگوں کو یاد آئے کہ یہ تھیلا کہاں سے ملا تھا یا چھینا تھا۔ کانسٹیبل ان کی ذرا خاطر تواضع کرو اور پھر لاکپ میں بند کر دو۔ انسپکٹر حبیب نے کہا۔

کچھ دیر بعد ان لوگوں کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ تم لوگوں کے گھر والوں کو بلایا جائے یا پھر تم سرکاری گھر میں خوش رہو گے۔ انسپکٹر حبیب نے کہا۔

یہ فون نمبر ہے جلدی سے بلوا دیں۔ رضوان نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد رضوان کے والد جمیل صاحب تھانے میں داخل ہوئے اور انہوں نے سب سے پہلے انسپکٹر حبیب سے ملاقات کی۔ انسپکٹر حبیب ان سے بڑی گرم جوشی سے ملے۔

لگتا ہے ڈاکٹر صاحب آپ اپنے مریض کو دیکھنے تھانے چلے آئے ہیں۔ اس لئے کہ میں کافی دنوں سے آپ کے ہسپتال میں نہیں آیا ہوں۔ انسپکٹر حبیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دراصل میں رضوان کے لئے آیا ہوں جمیل صاحب نے کہا۔

وہ رضوان جو رہزنی کے کیس میں پکڑا گیا ہے۔ انسپکٹر حبیب نے پوچھا۔

جی وہی لڑکا۔ جمیل صاحب نے کہا۔

آپ کا اس سے کیا تعلق ہے۔ انسپکٹر حبیب نے پوچھا۔

رضوان میرا بیٹا ہے۔ جمیل صاحب بمشکل بولے۔

اوہ!.....! انسپکٹر حبیب خاموش ہو گئے پھر کچھ دیر بعد بولے۔ میں اس کو آپ کی ضمانت پر چھوڑ دیتا ہوں مگر گھر لے جا کر اس کو اچھی طرح سمجھائیں کہ ایسی حرکتیں نہ کرے۔ انسپکٹر حبیب نے کہا۔

آپ کا بہت بہت شکریہ۔ جمیل صاحب نے کہا۔

جمیل صاحب رضوان کو گھر لے آئے۔

تم میرا آخری سہارا ہو۔ امید کی کرن ہو اس لئے تم صحیح راہ پر آؤ۔ چوری چکاری سے آدمی ذلیل و خوار ہو جاتا ہے بیٹا! برائی کبھی پھلتی پھولتی نہیں ہے۔ تم کو جس چیز کی ضرورت ہو۔ ہمیں کہو۔ ہم لوگ پوری کریں گے۔ جمیل صاحب نے رضوان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

مگر ابا جان میں نے کون سی چوری کی ہے۔ رضوان نے معصوم بنتے ہوئے کہا۔

پھر تمہیں پولیس تھانے کیوں لے گئی تھی۔ جمیل صاحب نے سوال کیا۔

پولیس تو ہر شہری کو تنگ کرتی ہے مجھے بھی شک کی بنیاد پر لے گئی تھی۔ رضوان نے کہا۔

اچھا بحث مت کرو اور اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ آئندہ میں کوئی شکایت نہیں سنوں۔ جمیل صاحب نے کہا۔

رضوان نے جمیل صاحب کی باتیں ایک کان سے سنی اور دوسرے سے نکال دیں اور ان کے سامنے کتابیں لے کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ رات کو بارہ بجے رضوان اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اس کی نظریں تو کتاب پر تھیں مگر دماغ نئے منصوبے بنانے میں مصروف تھا۔ باہر سے سیٹی کی آواز سنائی دی اور رضوان اشارہ سمجھ گیا کہ ضرور لطیف آیا ہے اور خاموشی سے کھڑکی کے راستے باہر گلی میں نکل گیا۔

یار تمہاری ضمانت کیسے ہوئی۔ رضوان نے پوچھا۔

بس ہو گئی اس کی فکر مت کرو۔ لطیف نے کہا۔

دہندہ اب کچھ دنوں کے بعد کریں گے ابھی حالات بھی گڑبڑ ہیں۔ رضوان نے کہا۔

جیسے تمہاری مرضی میں باقی ساتھیوں کو بھی اطلاع دے دوں گا۔ لطیف نے کہا۔

ایک ہفتہ بعد رضوان لطیف اور دوسرے ساتھیوں سے ملا۔

رضوان آج رات کو بڑا ہاتھ مارنا چاہئے۔ لطیف نے کہا۔

کیا ارادہ ہے۔ رضوان نے پوچھا۔

فینسی جیولرز کیسا رہے گا وہی جس کی حفاظت کے لئے بوڑھا چوکیدار مقرر ہے جو سر شام ہی جا کر سو جاتا ہے۔ لطیف نے کہا۔

چوکیدار کے بارے میں میں کافی دنوں سے معلومات جمع کر رہا ہوں اس لئے فکر کی کوئی بات نہیں۔ عاقل نے کہا۔

ٹھیک ہے مگر قطب اور تاج کہاں ہیں۔ رضوان نے پوچھا۔

وہ پرانے اڈے پر ہیں۔ عاقل بولا۔

راستے میں چلتے ہوئے رضوان نے کہا۔ یار! گھر والوں نے نصیحتیں کر کر کے پریشان کر دیا ہے۔ آج کا ڈاکہ کامیاب رہا تو میں گھر چھوڑ دوں گا اور کہیں اور ڈیرہ ڈال لوں گا۔

یہ تو اچھی بات ہے کیونکہ تم ساتھ ہوتے ہو تو کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ لطیف نے کہا۔

اڈے پر پہنچ کر ان لوگوں نے تیاری کی اور سکوٹروں پر سوار ہو کر جیولرز کی دوکان کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ کوئی ایک فرلانگ پہلے سکوٹروں کو ایک گلی میں کھڑا کیا اور پیدل جیولرز کی جانب چل دیئے۔

تم نے تمام سامان ہتھیار وغیرہ احتیاط سے رکھ لئے ہیں۔ تاج نے پوچھا۔

بالکل! ہر طرح کی تیاری مکمل ہے فکر مت کرو۔ لطیف نے کہا۔

انہوں نے دیکھا کہ بوڑھا چوکیدار ابھی تک سویا نہیں تھا۔

تم تو کہتے تھے کہ یہ چوکیدار گیارہ بجے سے پہلے سو جاتا ہے مگر اب تو بارہ بج رہے ہیں۔ قطب نے کہا۔

نہیں سویا تو کیا ہوا ابھی اس کو کلوروفارم سے سلا دیتے ہیں۔ تاج نے کہا۔

ٹھیک ہے یہ ابھی گشت کر رہا ہے جب گلی کے کونے پر آئے تو تم ایک دم اس کے سامنے آجانا اور کلوروفارم کا رومال اس کے منہ پر لگا دینا۔ رضوان نے کہا۔

تاج منہ پر ایک تھیلی نما کپڑا چڑھا کر آگے بڑھا جس میں آنکھوں اور ناک کے پاس سوراخ بنے ہوئے تھے جبکہ باقی افراد یہ کارروائی چھپ کر دیکھنے لگے۔

وہ بوڑھا چوکیدار آگے بڑھتا ہوا گلی کے کونے تک آئے بغیر واپس مڑ گیا۔ تاج بالکل تیار تھا مگر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اور اس کا دوبارہ انتظار کرنے لگا۔ چوکیدار اپنا راؤنڈ مکمل کر کے واپس مڑا اور تاج کی جانب قدم بڑھانے لگا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ گلی کے کونے پر شکاری تاک لگائے بیٹھا ہے۔ رفتہ رفتہ تاج اور چوکیدار کا فاصلہ کم ہوتا گیا اور گلی کے کونے سے جیسے ہی چوکیدار واپس مڑا اس کے پیچھے تاج نمودار ہوا اور رومال اس کے منہ پر لگا دیا۔ چوکیدار نے معمولی سی مزاحمت کی اور بے ہوشی کی وادیوں میں گم ہو گیا۔ تاج نے اس کو دیوار کے کنارے سے لگا کر یوں بٹھا دیا جیسے بیٹھے بیٹھے سو گیا ہو۔ ہاتھ کے اشارے سے رضوان، لطیف، عاقل اور قطب کو بلایا اور ان لوگوں کے قدم فینسی جیولرز کی دکان کی جانب اٹھنے لگے۔ دکان کے آلارم وغیرہ ناکارہ کرنے کے بعد انہوں نے تالے کھولے اور کچھ توڑ دیئے اور کامیاب ڈاکہ ڈالا اور اپنے اڈے پر واپس پہنچ گئے۔

کہو آج کا مشن کیسا رہا۔ رضوان نے پوچھا۔

بہت ہی خوب لطیف نے کہا۔

اب ہم لوگوں کو یہ اڈا چھوڑ دینا چاہئے۔ کیونکہ مال تو آج کافی ہاتھ لگ گیا ہے تاج نے کہا

مگر جائیں گے کہاں۔ مال زیادہ ہو گیا ہے تو کیا کوئی کوٹھی لو گے۔ قطب نے کہا۔

نہیں یار ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے بلکہ ہم لوگوں کو اپنے علاقے سے دور پہاڑی علاقے میں چلا جانا چاہئے۔ وہاں کسی غار میں ٹھکانہ بنالیں گے۔ عاقل بولا۔

تم سب لوگوں کا کیا خیال ہے اس بارے میں۔ رضوان نے سب سے رائے طلب کرتے ہوئے پوچھا۔

ہم لوگ تیار ہیں سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

یہ سب لوگ پہاڑی غار میں منتقل ہو گئے۔ رضوان قطب۔ عاقل۔ تاج اور لطیف کے والدین نے ان لوگوں کو بہت تلاش کروایا مگر کسی کا کچھ پتہ نہ چلا آخر یہ لوگ تھک ہار کر بیٹھ گئے۔

فینسی جیولرز کے ڈاکے کے بعد ان کے حوصلے بڑھ گئے تھے اور یہ لوگ ڈاکوؤں کے روپ میں نمودار ہوتے تھے۔ رضوان کا گروہ آئے دن منصوبہ بندی کے ساتھ ڈاکے ڈال رہا تھا اور لوٹ مار کر کے واپس آجاتے تھے ایک رات رضوان کے گروہ نے ایک مکان پر نقب لگائی اور گھر میں داخل ہو گئے۔ لطیف گلی کے باہر کھڑا پہرہ دیتا رہا۔ انہوں نے گھر والوں کو بندوقوں کے زور پر خاموش رہنے کا حکم دیا اور سامان سمیٹنے لگے ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے ان لوگوں کو خدا کا واسطہ بھی دیا کہ وہ بیوہ کا مال اسباب نہ لوٹیں مگر رضوان نے بوڑھی عورت کو بندوق کا دستہ مار کر بے ہوش کر دیا اور تمام سامان سمیٹ کر اپنے اڈے پر پہنچ گئے جہاں مال کا بٹوارا ہوا۔ کئی دن یہ لوگ آرام سے رہے

استاد! ہمارے اڈے سے کوئی تین میل دور ریل کی پٹڑی ہے لطیف نے کہا۔

تو کیا ریل کی پٹڑی چوری کرنے کا ارادہ ہے۔ تاج نے درمیان سے بات اچک لی۔

نہیں تاجو یہ بات نہیں ہے۔ لطیف نے جھنجھلا کر کہا۔

تو بات کیا ہے۔ قطب نے کہا۔

پہلے مجھے تو کہہ لینے دو۔ تم لوگ درمیان میں اپنی باتیں شروع کر دیتے ہو۔ لطیف نے کہا۔

پھر کہو۔ سوچ کیا رہے ہو' رضوان نے کہا۔

بات یہ ہے کہ ہمارے اڈے سے تین میل دور ریل کی پٹڑی گزرتی ہے کبھی کبھی لائن صاف نہ ہونے کی وجہ سے ریل کو اس علاقے میں رکنا پڑتا ہے۔ لطیف سانس لینے کے لئے رکا۔

تو کیا ریل کا ڈبہ چوری کرنے کا ارادہ ہے۔ تاج نے لقمہ دیا۔

بات تم نے پوری سنی نہیں ہے بولنا شروع کر دیا۔ لطیف نے غرا کر کہا۔

غصہ مت کر لطیف' بات پوری کر۔ رضوان بولا۔

اس لئے میں نے منصوبہ بنایا ہے کہ ریل میں لوٹ مار کی جائے لطیف نے بات مکمل کی۔

کیاسب کے سب ایک ساتھ ایک ہی ڈبے میں لوٹ مار کریں گے۔ رضوان نے سوال کیا۔

نہیں استاد! اس کے بجائے..... علیحدہ علیحدہ ڈبے میں جائیں۔ لطیف نے کہا۔

اس کا فائدہ کیا ہو گا..... ساتھ رہے تو اچھا ہو گا ایک دوسرے کی مدد کر سکیں گے قطب نے کہا۔

اس سے نقصان یہ ہو گا کہ لوگوں کو ہم پر شک ہو جائے گا۔ اور ایک ڈبے سے مال بھی کم ہاتھ آئے گا۔ لطیف نے کہا۔

یہ بات واقعی درست ہے۔ رضوان نے تائید کی۔

ٹھیک ہے کل ہم لوگ ریل میں ڈاکہ ڈالنے کے لئے تیار رہیں گے اور سر شام ہی ریلوے لائن کے پاس چلے جائیں گے۔ تاج نے کہا۔

دوسرے روز رات کو یہ لوگ ریلوے لائن کے قریب اگی ہوئی جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے تھے اور ریل کا انتظار تھا۔

لطیف ریل کتنے بجے یہاں آتی ہے۔ قطب نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

ساڑھے گیارہ بجے۔ لطیف نے کہا۔

مگر اب تو بارہ بج رہے ہیں شائد ریل لیٹ ہو گئی ہے عاقل نے کہا۔

دور سے ریل کی سیٹی سنائی دی۔ ریل آ رہی ہے تیار ہو جاؤ۔ رضوان نے کہا۔

ریل برق رفتاری سے نزدیک آتی گئی اور پھر رکے بغیر گزر گئی۔ یا ریہ تو رکے بغیر گزر گئی۔ قطب نے پوچھا

لائن صاف تھی اس لئے گزر گئی کل رات پھر انتظار کریں گے۔ کل لائن کلیئر نہ ہوئی تو یہ اسی جگہ رک جائے اور ہمارے مزے ہو جائیں عاقل نے کہا۔

آخر تیسرے دن ان کی امید بر آئی اور لائن کلیئر نہ ہونے کی وجہ سے ریل رک گئی۔

سب لوگ ہوشیار رہ کر ہاتھ صاف کریں اور کسی کا انتظار کئے بغیر اڈے پر چلے جائیں۔ رضوان نے ہدایات جاری کرتے ہوئے کہا۔

سب نے علیحدہ علیحدہ ڈبوں میں دھاوا بول دیا اور مال و اسباب لوٹنے لگے۔ رضوان ایک ڈبے میں داخل ہوا جہاں پر کوئی مسافر چادر تانے برتھ پر سو رہا تھا۔ ڈبے میں بلب فیوز ہونے کی وجہ سے تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رضوان سونے والے مسافر کا بریف کیس خاموشی سے اٹھانا چاہتا تھا کہ اسی دوران مسافر کی آنکھ کھل گئی۔ رضوان نے منہ پر کپڑا باندھا ہوا تھا اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھی اس مسافر نے رضوان پر حملہ کر دیا اور رضوان سے الجھ گیا۔ رضوان اس حملے کے لئے بالکل تیار نہ تھا وہ گھبرا گیا کہ کہیں ڈبے میں سوئے ہوئے دیگر مسافر نہ جاگ جائیں۔ اتنے میں لائن کلیئر ہو گئی اور ریل آہستہ آہستہ چلنے لگی اس مسافر نے رضوان کو دبوچ لیا اور رضوان اور اس مسافر میں کشمکش ہونے لگی۔ رضوان نے اپنی جیب سے خنجر نکال کر اس پر حملہ کر دیا وہ شخص

ایک جھٹکے سے گرا اور تڑپنے لگا گاڑی اس وقت تک کافی رفتار پکڑ چکی تھی لیکن رضوان کو خطرہ تھا کہ لوگ جاگ نہ جائیں اور وہ پکڑا نہ جائے اس نے چلتی ریل سے چھلانگ لگا دی۔ زمین پر گرنے سے اسے زخم آئے اور وہ اپنے اڈے پر پہنچا وہاں پر اس کے باقی ساتھی جمع تھے انہوں نے اپنا اپنا مال رضوان کے سامنے رکھ دیا اور رضوان نے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کی تفصیل سنا دی۔

شہر سے جا کر کھانے کا سامان تو لے آؤ۔ راشن وغیرہ ختم ہو گیا ہے۔ صبح کو رضوان نے عاقل سے کہا۔

ٹھیک ہے میں ابھی چلا جاتا ہوں۔ عاقل بولا۔

اپنا حلیہ درست کر لو کسی کو شک نہ گزرے۔ رضوان نے ہدایات دیں۔

عاقل شہر سے سامان لے کر واپس ہوا تو اسی صبح کا اخبار بھی لیتا آیا۔ اس نے سامان دیتے ہوئے کہا۔ آج کے اخبار میں ہمارا رات والا کارنامہ بھی آیا ہے۔ مسافروں کا دو لاکھ کا سامان اس ڈاکے میں لٹا ہے۔

وہ سب کے سب اخبار میں اسی خبر کو پڑھنے لگے۔ رضوان ایک خبر پڑھ کر چونک گیا۔ اخبار میں لکھا تھا کہ کل رات شہر کے مشہور و معروف ڈاکٹر جمیل کو خیبر میل میں دوران سفر کسی درندہ صفت شخص نے قتل کر دیا۔ لوگوں نے چلتی ریل سے کسی کو کودتے ہوئے دیکھا تھا جو فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

رضوان اس سے آگے مزید کچھ اور نہ پڑھ سکا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ قدرت کے اس انتقام پر حیرت زدہ تھا اس کو اپنے والد کے الفاظ بڑی شدت سے یاد آ رہے تھے کہ برائی کبھی پھلتی پھولتی نہیں ہے وہ کافی دیر تک روتا رہا اسے کیا معلوم تھا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے آخر ایک فیصلہ کر کے اٹھا اور اپنے ساتھیوں کو کچھ کہے بغیر تھانے کی جانب قدم اٹھانے لگا۔

تھانے پہنچ کر اس نے اپنی تمام چوریوں ڈاکے اور اپنے والد کے قتل کے بارے میں ایک ایک بات بتا دی اس کے دیگر ساتھیوں کے لئے چھاپے مارے گئے اور پولیس نے ان کو گرفتار کر لیا۔ پولیس نے عدالت میں رضوان کا چالان پیش کیا۔ رضوان وعدہ معاف گواہ بن گیا اس نے تمام حقائق سے عدالت کو آگاہ کیا۔ جج صاحب نے اس کو چھ سال قید کی سزا سنائی۔ اس موقع پر اس کی ماں بھی عدالت میں موجود تھی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

چھ سال کا عرصہ رضوان نے جیل میں بہت ہی شرافت سے گزارا اور جیل سے رہا ہو کر واپس اپنی ماں کے پاس آیا۔ وہ اپنے ماضی پر بے حد شرمندہ تھا اور اپنے والد کی ہلاکت کی وجہ سے دل برداشتہ بھی۔ مگر اس کی ماں نے اس کو سمجھایا کہ وہ واپس ایک معزز شہری بن سکتا ہے کہ دوبارہ تعلیم کا سلسلہ شروع کرے اور اپنے والد کی روح کو اس طرح سکون پہنچا سکتا ہے کہ ان کی خواہش پوری کرے۔ رضوان نے اپنی ماں سے وعدہ کیا کہ وہ ڈاکٹر بن کر اپنے والد کی روح کو سکون پہنچائے گا اور اس نے دوبارہ کالج میں داخلہ لیا۔ دو سال کا عرصہ پلک جھپکتے ہی گزر گیا جب انٹر کا رزلٹ آؤٹ ہوا تو رضوان نے امتیازی نمبر حاصل کئے تھے اس کو کسی دشواری کے بغیر میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا اور وقت کا پہیہ چلتا رہا۔ اور رضوان نے ڈاکٹر بن کر ماضی کا کفارہ ادا کر دیا۔

اختر عباس

قُدرت کا انتقام

رکشے سے اتر کر جس چیز پر سب سے پہلے عثمان کی نظر گئی وہ گندگی سے اٹا ہوا ایک بدبو دار چرہ تھا۔ جو فٹ پاتھ پہ نیم کے گھنے درخت تلے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ نجانے اس کے چہرے میں کیا بات تھی کہ عثمان پہ کپکپی طاری ہو گئی مگر وہ پیر بھی اپنا بیگ اٹھا کر اس کا ذرا قریب سے جائزہ لینے لگا۔ چہرے پہ بے تحاشا بال پڑے ہوئے تھے بے نور آنکھیں جو میل سے بھری ہوئی تھیں۔ ہاتھوں کے ناخن مٹی سے لتھڑے ہوئے 'ایک بازو بھی شاید فالج زدہ تھا۔ اور اس کے منہ سے مسلسل رال ٹپک رہی تھی۔ جو اس کے بڑھے ہوئے بالوں اور غلیظ کپڑوں پہ گر رہی تھی۔

"اف" خدایا! اسے دنیا میں ہی کتنا عذاب مل رہا ہے۔ نجانے کیسی بری زندگی گزار تا رہا ہے"

دن کے دو بجنے والے تھے اور عثمان ابھی ابھی کراچی ریلوے سٹیشن پہنچا تھا۔ گاڑی حسب معمول دو گھنٹے لیٹ پہنچی تھی۔ لاہور سے کراچی تک کے اس طویل سفر نے اسے تھکا دیا تھا۔ مگر اس آخری منظر نے تو اسے اذیت سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

☆

نو بہار کالونی میں زیادہ تر متوسط طبقہ کے گھر تھے کہیں کہیں کوئی بڑی سی کوٹھی نظر آتی تھی۔ اتفاق سے جس جگہ بوڑھا فقیر بیٹھا تھا۔ اس کے تھوڑی دور دائیں ہاتھ بھی ایک بڑی سی کوٹھی تھی۔ عثمان سامنے سے گزرا تو بڑی ہی خوبصورت نیم پلیٹ جگمگا رہی تھی۔ سیٹھ کرم علی۔

نام تو سیٹھ ہے اور کام بھی سیٹھوں والے ہی ہیں۔ کبھی ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی ہو گی۔ پتہ نہیں لوگ کن دھندوں میں الجھے ہوئے ہیں اپنے قرب وجوار میں نظر ہی نہیں جاتی۔

انہی سوچوں میں غرق چلتے چلتے چند مکانوں کو چھوڑ کر وہ اپنے ماموں کے دروازہ پر لگی کال بیل بجا رہا تھا۔ ماموں اور ممانی گھر پہ ہی تھے اور اس کے منتظر۔ بہت دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ عثمان کے اس انعام کا بھی

ذکر چلتا رہا جو اس نے تخریب کاروں کے گروہ کو پکڑوا کر حاصل کیا تھا۔ عصر کی نماز پڑھنے جب عثمان اپنے ماموں کے ساتھ جا رہا تھا تو ایک بار پھر بوڑھے آدمی کے اڈے کے پاس سے گزرے مگر اس وقت وہ لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ لحاف کیا تھا میلا کچیلا جیسے کسی نے مٹی کا لیپ کیا ہوا ہو۔ جگہ جگہ سے کٹا پھٹا۔ عثمان کو پہلی بار اس پر ترس آیا۔ ٹھٹھرتی رات کا تصور کرتے ہوئے وہ بے چین سا ہو گیا۔ اگلے روز اس نے اپنی ممانی سے بات کی کہ کوئی کمبل یا لحاف چاہئے تاکہ بوڑھے فقیر کو دیا جا سکے۔ ممانی نے کہا بیٹا فالتو تو کوئی نہیں ہے سارے نئے اور استعمال والے ہیں۔ عثمان نے سوچا ہم بھی عجیب لوگ ہیں غریبوں کو صرف پرانی چیزیں دیکر ہی خوش ہوتے ہیں کہ چلو نیکی بھی ہوئی اور پرانی چیز سے جان بھی چھٹ گئی۔ حالانکہ اس نیکی کا ثواب بھی کٹا پھٹا اور تھوڑا سا ہی ملے گا۔

یہی سوچ کر اس نے طے کیا کہ اپنی جیب سے پیسے خرچ کئے جائیں دوپہر کو جب ممانی سو رہی تھیں وہ بازار گیا اور ایک لحاف خرید لایا۔ بوڑھے فقیر نے اسے لحاف اوڑھاتے ہوئے دیکھا اور بڑی ممنونیت کے طور پر اس کو دیکھا۔ اس کے کچھ بولنے سننے سے قبل عثمان وہاں سے چلا آیا۔ یہ تو اسے یقین تھا کہ کھانا تو اللہ تعالیٰ نے ننھے منے کیڑے کو اور خشک پہاڑوں پہ بسنے والے جانداروں کو بھی پہنچا دیتا ہے۔ مگر پھر بھی آخر اس کو کون دیتا ہو گا۔ رات کو جب وہ سویا تو طے کر چکا تھا کہ جتنے روز وہ کراچی میں ہے کھانا اسے دے آیا کرے گا۔ اتفاق سے اگلی صبح ممانی کچھ خریدنے ماموں کے ساتھ ہی چلی گئیں۔ اور عثمان کو باورچی خانے سے دودھ اور روٹی مل گئی۔ وہ پانی سے بھرا لوٹا ساتھ لے جانا نہیں بھولا۔ "بابا منہ ہاتھ دھو لو اور کچھ کھا پی لو۔ میں دوپہر کو واپس آؤں گا۔" فقیر بابا اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور وہ واپس پلٹ آیا۔ اصل میں وہ وہاں کھڑا ہونا بھی چاہتا تو نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ وہ جس صاف ستھرے ماحول میں پلا تھا وہاں گندگی اور بدبو کا تصور بھی جان لیوا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ مجبور تھا۔

دوپہر کو اس نے ممانی سے پوچھ کر روٹی پہ سالن ڈلوایا اور وہاں پہنچ گیا۔ اسے کوئی اور مصروفیت ہوتی بھی تو وقت نکال ہی لیتا کیونکہ جس کام کو وہ طے کر لے کبھی نامکمل نہیں چھوڑتا تھا۔ اب تو ویسے بھی ماموں نے ابھی اسے فراغت کا مژدہ ہی سنایا تھا کہ وہ دفتر کے کام ایک دو دن میں نمٹا کر پھر خوب سیر کریں گے۔

عثمان نیم کے پیڑ کے نیچے پہنچا تو اسے بوڑھا بابا اپنا منتظر ملا۔ روٹی دیکھ کر اس کی آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی۔ عثمان کچھ دیر تو کھڑا سوچتا رہا پھر وہیں ذرا صاف سی جگہ پہ بیٹھ گیا۔ عثمان فقیر کے بارے میں تفصیلات جاننے کا خواہش مند تھا۔ اس نے کرید کرید کر کئی سوالات کئے۔ جواب میں ایک درد بھری کہانی سامنے آئی جو بوڑھے فقیر نے بڑی وقت اور رقت سے سنائی۔ عثمان نے سوچا دنیا بھی کیا جگہ ہے کہ انسان کو اپنے کئے ہوئے اچھے اور برے اعمال کا کچھ نہ کچھ بدلہ ضرور مل جاتا ہے۔ گھر آتے ہوئے عثمان کو ظلم اور ظالم نظام سے اور بھی نفرت پیدا ہو چکی تھی کہ جس کی چکی میں پس کر آدمی اکثر ایسے کام کرنے لگتا ہے کہ انسانیت کا سر بھی شرم سے جھک جاتا ہے۔

بوڑھے فقیر نے بتایا کہ اس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ ایک بڑے جاگیردار کی خدمت میں گزارا۔ اس کے کہنے پہ کتنے ہی قتل کئے۔ کتنے ہی لوگوں کے گھر اجاڑے مگر پھر اس ظالم نے ایک چھوٹی سی بات پہ اس کے بیوی

بچوں کو غائب کروادیا۔ اور اسے جیل کروادی۔ جب جیل سے رہا ہوا تو معلوم ہوا کہ بیوی نے خودکشی کرلی ہے اور دونوں بچے جاگیردار نے کسی کو دے دیئے ہیں۔ وہ بہت عرصہ انہیں ڈھونڈتا رہا مگر انہیں نہ ملنا تھا نہ ملے اور یہ جدائی کے زخم لئے کراچی آگیا اور زندگی کی گاڑی کو چلانے کیلئے مزدوری شروع کر دی۔ پھر کئی سال پہلے ایک میڈیکل سٹور پہ ملازم ہو گیا۔ وہاں پہلے وہ چوکیدار تھا پھر دن کو کام کاج کیلئے اس کی ڈیوٹی لگی وہیں ایک غریب لڑکے سے اس کی ملاقات ہوئی جو اپنے نشے کے عادی باپ کیلئے دوائی لینے آتا تھا۔ اکیلا تو تھا ہی اس کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا۔ تنخواہ میں سے اکثر پیسے وہیں خرچ کرتا رہا مگر وہ بوڑھا نہ بچ سکا۔ پھر اس کے بیٹے کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ کچھ سال پہلے وہ مزدوری کیلئے دبئی چلا گیا۔ پیچھے اس کے رشتہ داروں نے گھر خالی کرالیا انہی دنوں اس پہ فالج کا حملہ بھی ہو گیا۔ اب نہ کوئی پوچھنے والا تھا۔ نہ خیال رکھنے والا۔ نوکری چھوٹ گئی اور دربدری قسمت کا روگ بن گئی۔ اسی لڑکے کا ایک دوست اب رات کو آتا ہے۔ کھانے کیلئے روٹی دے جاتا ہے اور سارے دن کی کمائی اٹھا کر لے جاتا ہے۔ بچوں کی یاد میں رو رو کر بینائی بھی تقریباً ختم ہی ہو گئی ہے۔ بس ایک آنکھ سے تھوڑا تھوڑا نظر آتا ہے۔ اب تو دن رات موت کی ہی آرزو ہے مگر وہ نہیں آتی۔ لگتا ہے اللہ سارے گناہوں کا بدلہ یہیں پہ دے دینا چاہتا ہے۔ سارا دن اللہ توبہ اللہ توبہ کا ورد ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی خدا ترس کھانے کو دے جائے تو دے جائے ورنہ اگلی رات تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔

عثمان اس کی ساری داستان سن کر اس سے بڑی ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ "یہ حکومت معذور اور بے سہارا لوگوں کے گھروں کا بڑا اشتہار دیتی رہتی ہے۔ کیا ایسے لوگ انہیں نظر نہیں آتے"۔ واپس آتے ہوئے اس کی نظر سیٹھ کریم علی کی کوٹھی کے پیچھے بنے ہوئے دو سرونٹس کوارٹرز پہ پڑی مگر پھر وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ یہ سیٹھ لوگ تو اکثر اپنے گناہوں کو چھپانے کیلئے ان گھروں کو استعمال کرتے ہیں کسی کو کیا پناہ دیں گے۔

☆

اگلی شام "بل پارک" کی سیر کرتے ہوئے عثمان نے ماموں سے پوچھا یہ آپ کے محلہ دار سیٹھ صاحب کیا شغل فرماتے ہیں۔ ماموں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا کیوں رگ جاسوسی پھڑک رہی ہے کیا؟ پھر انہوں نے بتایا کہ کچھ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا ہے۔ بڑے لمبے ہاتھ ہیں اس کے۔ کوئی فیکٹری ویکٹری بھی ہے۔ کالا دھندہ بے شمار ہے مگر نہ کوئی اشارہ کرتا ہے نہ کوئی پکڑتا ہے۔ پکڑنے والے خود اس کے محافظ ہیں۔ باتیں جاری رہیں مگر سیر ختم ہو گئی۔ جب وہ رات گئے گھر جانے کیلئے بابے کے پاس سے گزرے تو وہاں ایک اور سایہ بھی نظر آیا۔ عثمان سمجھ گیا کہ وہی لڑکا ہو گا..... رات تیز ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہیں بادل گرجتے رہے۔ صبح عثمان نے ایک سویٹر بھی لنڈے سے خرید کر بابے کو دیا۔ اور پوچھا اگر بارش ہو گئی تو کیا کرو گے؟

"کرنا کیا ہے صبر شکر کر کے پڑا رہوں گا"۔ عثمان نے سوچا کاش بارش میں سیٹھ کا سرونٹ کوارٹر اسے پناہ دے سکتا۔ آج بابا نے ایک اور خوفناک بات بتلائی کہ وہ لڑکا کہہ رہا تھا کہ بہت تنگ آگیا ہوں۔ روز

نہیں آسکتا بوڑھا موت کی دعا کر رہا تھا کہ مرجاؤں تو اچھا ہے۔ اس کی جان بھی چھوٹے لڑکا کہہ گیا تھا کہ مجھ سے نہ تمہاری تکلیف دیکھی جاتی ہے اور نہ بار بار جھک ماری جاتی ہے۔"

بوڑھا شاید رو رہا تھا۔ اس کے منہ سے شوں شوں اور کبھی خرخر کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ "یا اللہ مجھے موت کیوں نہیں آجاتی۔ کوئی زہر ہی کیوں نہیں دے جاتا۔ میرے بس میں ہو تو کسی گاڑی کے نیچے آجاؤں۔ چاقو ہی سینے میں گھونپ لوں"

انسان زندگی سے جتنی محبت کرتا ہے۔ کبھی حالات اسے موت سے محبت پہ مجبور کر دیتے ہیں مگر وہ بھی ترسا ترسا کر آتی ہے۔ انسان تو مجبور محض ہے۔ ایسے ہی کم ظرفی سے اتراتا ہے۔ ناز کرتا ہے مگر انجام سے بے نیاز رہتا ہے۔ کاش وہ وقت کی ریت ہاتھوں سے نکلنے سے پہلے سنبھل جایا کرے۔

عثمان نے گھر آتے ہوئے ایک لمبی سی کار سے سیٹھ کرم علی کو بھی اترتے دیکھا۔ ٹھگنے سے قد کا سیٹھ ڈرے ہوئے ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا اندر جا رہا تھا۔ گاڑی فوراً ہی واپس چلی گئی۔

سیٹھ کرم علی ڈرائنگ سے ہوتا ہوا اپنے بیڈ روم تک تقریباً بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کا ماتھا پسینے سے شرابور تھا۔ اس کا چہرہ کسی انجانے خدشے سے سہما ہوا تھا۔ معاملہ کچھ تھا ہی ایسا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایسی ایسی خبریں سننے کو مل رہی تھیں کہ اس نے کبھی اس رخ پہ سوچا ہی نہ تھا۔ پیسے کو خدا سمجھنے والے عام طور پہ مشکل حالات میں ایسے ہی پریشان ہوتے ہیں جب پیسہ کام نہیں آتا۔ آخر سب لوگ تو ایک جیسے نہیں ہوتے کہ پیسے کو دیکھ کر بچھتے چلے جائیں۔ پیسے کے ترازو پہ تلتے جائیں اور بکتے جائیں۔ ایس پی احمر بھی شاید ایسے ہی لوگوں میں تھا۔ مگر افسوس کہ ایسے لوگوں کی تعداد اندھیری برستی ساون کی رات میں کہیں کہیں چمکنے والے تاروں کی طرح کم ہوتی ہے۔ ایس پی احمر نے رات بن قاسم پورٹ سے کچھ دور ایک خفیہ ٹھکانے پہ رکنے والی دو لانچیں پکڑیں تھیں ایک اسلحے سے بھری ہوئی تھی اور دوسری میں چرس اور افیون جیسی سستی نشہ آور چیزوں کو ہیروئن میں تبدیل کرنے والی مشینری تھی جو یہ لوگ گوادر کے ساحلوں کی طرف کسی جگہ نصب کرنے لے جا رہے تھے۔ وہاں سے جو کارندے پکڑے گئے وہی نشاندہی کرتے گئے اور ایس پی احمر سیٹھ کی فیکٹری تک پہنچ گیا یہ فیکٹری شہر سے یونیورسٹی جانے والی سڑک پہ ایک ایسی جگہ واقعی تھی جہاں بظاہر سوڈا واٹر بھرنے کی ایک فیکٹری تھی۔ انتہائی گنجان آباد جگہ پہ کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ شہر میں فسادات کیلئے اسلحہ سپلائی کرنے کا اڈا یہی ہے۔ مگر حقیقت یہی تھی تہہ خانوں میں جدید ترین اسلحہ اور گولیوں کی موجودگی اس حقیقت کے ثبوت کے طور پر موجود تھیں۔ کوئی اور ہوتا تو چند لاکھ پہ سودا طے ہو جاتا اور معاملہ ٹھپ ہو جاتا۔ آخر مجرم اور ان کے گروہ ایسے ہی تھوڑی دندناتے پھرتے ہیں۔ انہیں اپنے قانونی اور آئینی محافظوں کی پوری حفاظت اور پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اب بھلا کروڑوں کے بزنس میں سے چند لاکھ ایسے لوگوں کے منہ بند کرنے کیلئے خرچ کرنا کون سا مہنگا سودا ہے۔ نرا منافع بخش سودا اسے ہی تو کہتے ہیں۔

سیٹھ کی بیوی فوراً ہی اپنے شوہر کی مزاج پرسی کیلئے پہنچ گئی مگر مزاج نہ صرف برہم بلکہ پریشان بھی پایا۔

سیٹھ نے اپنے خاص کارندے اور منیجر کو بلانے کا کہا۔ وہ پچھلے کمرے میں فائلوں میں ردو بدل میں مصروف تھا۔ سیٹھ صاحب اسے دیکھ کر دہاڑے منیجر تمہیں علم ہے یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ آخر اس کم بخت کا منہ بروقت بند کیوں نہیں کیا گیا بڑا ایس پی بنا پھرتا ہے۔ لاکھوں کا نقصان ہوا اور اب جان کے الگ لالے پڑے ہوئے ہیں وہ صبح سے شکاری کتوں کی طرح میری تاک میں ہے۔ میں سارا دن ادھر ادھر گزار کر گھر آیا ہوں کہ اسے یہ شک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بھلا گرفتاری کیلئے مطلوب لوگ کیا گھروں پہ ملتے ہیں۔ گھر پہ اس وقت تین ذاتی ملازموں کی موجودگی اسے بھلی محسوس ہو رہی تھی کہ مشکل وقت میں کام ہی آئیں گے۔ سیٹھ کی بیوی اس ساری کارروائی سے بے خبر تھی۔ اسے شاپنگ کیلئے بے تحاشہ پیسہ مل جاتا تھا۔ ملازموں کی موج تھی۔ نئے ماڈل کی گاڑیاں تھیں۔ بیٹی شاندار طریقے سے بیاہ دی تھی۔ نہ کھانے کی فکر نہ پہننے کی۔

اچانک اس نے دیکھا سیٹھ صاحب منیجر کے ساتھ چھت کی طرف جا رہے ہیں اتنی رات گئے چھت پہ کیا لینے گئے ہیں؟ وہ یہی سوچتی اس کے پیچھے لپکی۔ سیٹھ صاحب کہہ رہے تھے اگر پولیس آ گئی تو کیا ہو گا۔ نکلنے کا راستہ سوچو۔ صرف آج کی رات..... صرف آج کی رات کل ایس پی کا باپ بھی مجھے نہیں پکڑ سکے گا۔ فضلو پاسپورٹ بنوا چکا ہے۔ ٹکٹ صبح تک لے آئے گا۔ یہ نہ ہو سکا تو موٹر بوٹ تک پہنچنا کوئی مسئلہ نہیں وہاں سے پھر کھلا سمندر اور ہر خوف سے بے نیاز زندگی۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ منڈیر کی طرف گیا اور یکدم کسی سوچ میں پڑ گیا۔ منیجر اگر میں اس بوڑھے فقیر کی جگہ لے لوں تو بھلا کون پہچان سکے گا۔ منیجر نے اس تجویز پر داد دینے کیلئے اسے دیکھا اور فوراً کہا مگر اس بوڑھے کا کیا ہو گا۔ اسے وہاں سے اٹھوا دو اور خالی سرونٹ کوارٹر میں لٹا دو مگر گولیاں کھلا کر تاکہ اٹھ کر چیختا نہ رہے۔

بس یہی واحد حل ہے اور کوئی محفوظ اور بہتر راہ نہیں ہے۔ جاؤ اور ابھی انتظام کرو..... اور یوں کچھ دیر بعد بوڑھا فقیر بے ہوشی کی حالت میں خالی سرونٹ کوارٹر میں تھا۔

سیٹھ صاحب نے اپنے عالی شان اور آرام دہ گرم کپڑے اتارے اور پرانے سے کپڑے پہن کر ہلکی سی چادر سر پر لیکر ہولے ہولے نیم کے پیڑ کی طرف بڑھنے لگے۔ بوڑھے کا گند الحاف انہی کا منتظر تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے سرکش بندوں کو کیسے کیسے ذلیل کرتا ہے۔ مگر سمجھنے والی عقل عام طور پہ عبرت پکڑنے کی بجائے دوسروں کو متوجہ کرتی ہے اور خود اس انجام کو بھلا دیتی ہے۔

بوڑھوں اور فقیروں کو ہمیشہ دھتکارنے والا سیٹھ آج خود اسی غلیظ اور بدبو دار جگہ پہ تھا۔ وہ ابھی لحاف کو الٹ پلٹ کر صاف حصہ ڈھونڈ رہا تھا کہ ایک اور مصیبت آن پڑی۔ یہ بارش تھی جو صبح سے برسنے کی تیاری میں تھی۔ مجبوراً اسے لحاف اوڑھنا پڑا۔ پہلے تو ناک پہ ہاتھ رکھے رہا۔ پھر آہستہ آہستہ عادی ہونے لگا۔ بارش سے بھیگتے اسے گھنٹہ بھر ہو گیا مگر بارش تھی کہ رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جیب سے نیند کی ڈبل خوراک نکالی اور نگل گیا۔ صبح تو منیجر نے آ کر اٹھا ہی لینا تھا۔ رات ذرا آرام سے گزر جائے گی۔

صبح سویرے پولیس نے جب سیٹھ کے مکان کو گھیرے میں لیا اس وقت منیجر گاڑی نکال کر سیٹھ صاحب کو

لینے اور پھر محفوظ ٹھکانے پر پہنچانے کیلئے نکل رہا تھا..... مگر وائے ناکامی..... اس کی ایک نہ چلی۔ پولیس کی تلاشی میں خاصی دیر لگ گئی۔ ادر رات بارش تو دو اڑھائی گھنٹے ہی ہوئی ہو گی مگر نیم کا درخت ساری رات ٹپکتا رہا۔ سوئے ہوئے آدمی کو تو شاید سردی کا فوراً اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنا انتظام کر لیتا ہے مگر نیند کی ڈبل خوراک کھائے آدمی کو کیا پتا چلتا ہے۔ ذہن سو رہا تھا مگر جسم تو سردی کو محسوس کر رہا تھا اور ساری رات کی بارش کی ٹھنڈک اور گیلے بستر و لحاف نے سونے پہ سہاگے کا کام دیا۔

صبح عثمان نماز کیلئے اٹھا تو بہت پریشان تھا کہ رات اس بیچارے پہ کیا بیتی ہو گی۔ کاش وہ سیٹھ کے سرونٹ کوارٹر میں پناہ لے سکتا۔ دن نکلے جب وہ ناشتے سے فارغ ہو کر دودھ اور ڈبل روٹی لیکر نیم کے پیڑ کی طرف بڑھا اس وقت پولیس کی گاڑیاں سیٹھ صاحب کے گھر کو گھیرے ہوئے تھیں۔ عثمان مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس نے سوچا کہ برے کاموں کا نتیجہ ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے۔ آخر کبھی نہ کبھی تو اللہ کی پکڑ ہونی ہی ہوتی ہے۔

عثمان دھڑکتے دل سے بوڑھے کے پاس پہنچا۔ نیم کے پتوں سے پانی کے قطرے اب تک ٹپک رہے تھے۔ اس نے جلدی سے لحاف ہٹایا اور چیخ کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہاں سیٹھ کرم علی کی اکڑی ہوئی لاش تھی۔

•

بہت عرصہ گزرا افغانستان میں ایک ڈاکو بہت مشہور ہوا۔ اس کا نام منگو تھا وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ غاروں میں رہتا تھا۔ کبھی کبھی غاروں سے باہر نکلتا اور رات کی تاریکی میں گاؤں کے گاؤں لوٹ کر واپس چلا جاتا۔ لوگ اس کا نام سن کر ہی خوف سے کانپنے لگتے تھے۔ مائیں بچوں کو ڈرانے کے لئے منگو کا نام لیتی تھیں پولیس اسے گرفتار کرنے میں ناکام ہو چکی تھی وہ مزے سے ڈاکہ ڈال کر غاروں میں چھپ جاتا اور پولیس اسے ڈھونڈتی ہی رہ جاتی۔ دراصل یہ غار بہت محفوظ تھے اور ان تک جانے کا راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ کئی بڑے بڑے پولیس آفیسر بھی اسے گرفتار کرنے میں ناکام رہے تب اس علاقے کے نئے تھانے دار محی الدین نے عہد کیا کہ وہ اسے ضرور گرفتار کر کے رہے گا۔ منگو کے ساتھی اکثر بھیس بدل کر آس پاس کے گاؤں میں جاتے رہتے تھے تاکہ صورت حال کا پتہ چلتا رہے۔ منگو ڈاکہ ڈالنے کا پروگرام ان کی معلومات کے مطابق ہی بناتا تھا۔

ایک روز منگو اپنے غار سے باہر دھوپ میں بیٹھا اپنی بندوق صاف کر رہا تھا کہ اس کا ایک ساتھی جو قریبی گاؤں گیا ہوا تھا بکریاں چرانے والے کے بھیس میں چند بکریوں کو ہنکاتا ہوا اس کے قریب آیا۔

"سلام سردار"

وعلیکم اسلام کیا خبر ہے راجو"

"بڑی زبردست خبریں ہیں سردار"

"کیا؟"

منگو نے بھنویں اچکائیں۔

"ایک نیا تھانے دار آیا ہے سردار، اور اس نے قسم کھائی ہے کہ تمہیں گرفتار کر کے رہے گا"۔

"اچھا"

منگو نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"تو پھر ہو جائے ایک زبردست حملہ..... خان گلریز خان کی حویلی پر۔"

"مگر سردار حالات موافق نہیں ہیں۔ سادالباس میں تھانے دار محی الدین کے آدمی ادھر ادھر سونگتے پھرتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ تمہارا نشانہ اب خان گلریز ہی ہو گا۔ اس نے تمہارا طریقہ کار اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ میں نے خود اسے بھی ایک دو بار خان کی حویلی کے آس پاس منڈلاتے دیکھا ہے۔ دراصل وہ جو قیمتی جواہرات اور موتیوں کی خبر تھی ناوہ دراصل محی الدین نے تمہیں چارا ڈالا ہے۔"

"اور ہم یہ چارا ہڑپ کر جائیں گے راجو۔"

منگو نے اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ تو سب کو مہم کی خبر دے دے۔

"جو حکم سردار"

راجو بکریوں کو وہیں چھوڑ کر غار میں چلا گیا۔

محی الدین پوری طرح مستعد تھا اسے یقین تھا کہ قیمتی جواہرات کی خبر سنتے ہی منگو، خان کی حویلی کا ضرور رخ کرے گا۔ چنانچہ اس کے آدمی سادالباس میں خان کی حویلی کے ارد گرد چکر لگاتے پھرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ خود بھی چکر لگا آتا۔ اس روز ابھی وہ خان کی حویلی کے پاس پہنچا ہی تھا کہ دو شخص اس حالت میں وہاں آئے کہ ان کی پگڑیاں ان کی گردن میں لٹک رہی تھیں بالوں میں خاک پڑی اور کپڑے کیچڑ اور مٹی میں لت پت ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص باقاعدہ واویلا کر رہا تھا

"اے سنو! کیا بات ہے تم پر کیا مصیبت آ پڑی ہے۔" محی الدین نے اس سے پوچھا۔

"منگو ڈاکو سے بڑی بھی کوئی اور مصیبت ہے۔ ہم لٹ گئے سرکار، منگو نے ہمیں لوٹ لیا۔"

منگو کا نام سن کر محی الدین چونکا۔

"آرام سے..... آرام سے ساری بات تفصیل سے بتاؤ..... بلکہ چلو اندر حویلی میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

وہ انہیں ساتھ ہی لے گیا اور ایک بڑے ہال نما کمرے میں ایک طرف بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اب بتاؤ"

"کیا بتاؤں جناب"

ایک شخص نے بدستور آہ وزاری کرتے ہوئے کہا۔

یہ ہمارے خان صاحب ہیں ان کے ادھر غربی کی طرف انگوروں کے باغات ہیں ادھر یہاں سے تین میل پرے ایک گاؤں میں خان صاحب کے ایک دوست رہتے ہیں ان کا خط ملا کہ وہ مصیبت میں ہیں اور اسے کچھ رقم چاہئے۔ سو خان صاحب اسی وقت رقم کا بندوبست کر کے مجھے ساتھ لے کر چل پڑے لیکن برا ہو منگو اور اس کے ساتھیوں کا انہوں نے ہمیں راستے میں لوٹ لیا۔ ہمارے گھوڑے چھین لئے..... اور.....

کیا تم نے منگو اور اس کے ساتھیوں کی شکلیں دیکھی تھیں۔

محی الدین نے بے قراری سے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا

"نہیں..... انہوں نے منہ چھپا رکھے تھے۔"

"اوہ..... وہ کس طرف تھے۔"

"یہاں سے شمال کی طرف اور جناب....."

دوسرے شخص نے پہلی بار زبان کھولی۔

"ہم تو لٹ گئے سولٹ گئے پیسے جانے کا دکھ نہیں۔ غم ہے تو صرف یہ کہ دوست کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ لیکن جو لٹنے والے ہیں انہیں تو بچا لیجئے۔ یہاں کوئی تھانہ چوکی ہے تو خدا کے واسطے وہاں خبر کیجئے ہم تو اجنبی ہیں۔ نہ یہاں کے رہنے والوں کو جانتے ہیں اور نہ تھانے کی خبر ہے۔

آج رات کوئی خان گلریز خان ہے جس کی حویلی پر زبردست ڈاکہ پڑنے والا ہے۔

"کیا؟"

محی الدین سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہاں صاحب"

پہلے شخص نے بات شروع کی۔ ہم نے وہاں ڈاکوؤں کو یہی بات کرتے ہوئے سنا تھا۔ ہم جھاڑیوں میں دبکے بیٹھے تھے کہ کہیں ڈاکو پلٹ کر ہمیں مار ہی نہ دیں۔ کیا بھروسہ ان کا۔ للہ خان گلریز کو خبر کر دیجئے تاکہ وہ بچاؤ کر سکیں۔

"بے فکر رہو بھائی۔"

محی الدین کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

انشاءاللہ آج منگو کا فیصلہ ہو ہی جائے گا۔ آپ جہاں اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں یہ خان گلریز خان کی ہی حویلی ہے اور میں یہاں تھانے کا انچارج ہوں۔ محی الدین!"

پہلے شخص نے فوراً اٹھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔

اور پھر اجازت چاہی۔

"مگر آپ کہاں جائیں گے۔"

دوست کے پاس خالی ہاتھ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ واپسی کی سبیل کریں گے"

"مگر آج ہی اتنے سفر کے بعد میرے خیال میں تو آپ کو آرام کرنا چاہئے میں خان صاحب سے کہہ کر یہیں حویلی میں آپ کا انتظام کروائے دیتا ہوں۔ کل صبح آرام سے جایئے گا۔"

"یہ احسان کیا ہے تو پھر ایک اور احسان بھی کیجئے یہ انگوٹھی ہے 'اصلی ہیرا ہے' بہت قیمتی ہے 'اسے ڈاکوؤں کی نظر سے بچا کر میں نے جوتے میں ڈال دیا تھا اسے فروخت کر کے ہمارے لئے کل صبح دو گھوڑوں کا بندوبست کروا دیجئے گا۔

"ارے نہیں نہیں رہنے دیجئے گھوڑوں کا بندوبست ہو جائے گا۔"

خان گلریز جو اس اثنا میں اندر آ گیا تھا اس نے انگوٹھی واپس کرتے ہوئے کہا۔

"ہم آپ کے بڑے احسان مند ہیں۔"

احسان مند تو ہمیں آپ کا ہونا چاہئے کہ آپ نے ہمیں بروقت ڈاکوؤں کے حملے سے باخبر کر دیا۔"

"یہ تو فرض تھا ہمارا۔"

تو بس آپ کا فرض پورا ہوا اب ہمیں اپنا فرض پورا کرنے دیجئے۔

خان گلریز ہنسا۔

محی الدین رات ڈاکوؤں کے مقابلے کا انتظام کرنے کے لئے چلا گیا۔ تو خان گلریز کافی دیر تک ان سے گفتگو کرتا رہا۔ ہیرے کی وہ قیمتی انگوٹھی اس شخص نے بصد اصرار بطور تحفہ خان کو دے دی۔

وہ خان گلریز کے لئے بہت فکر مند تھا۔

بہت پکا انتظام ہونا چاہئے خان۔ منگو بہت چالاک ہے۔

ہمارے محی الدین صاحب بھی کم چالاک نہیں ہیں۔

خان گلریز ہنسے۔

"پھر بھی خان"

ارے آپ یونہی فکر مند ہو رہے ہیں۔ چلئے میں آپ کو سب انتظام دکھاتا ہوں۔"

"تجوریاں تو خالی پڑی ہیں اور اصل مال یہاں گتے کے ڈبوں میں بند سٹور میں پڑا ہے۔ منگو کو گمان تک نہیں ہو گا۔"

واقعی ہم قائل ہو گئے محی الدین صاحب کے۔

اس شخص نے اطمینان کا اظہار کیا تو خان گلریز خان نے انہیں مہمان خانے بھجوا دیا تاکہ وہ نہا دھو کر آرام کر سکیں۔

شام ہوتے ہی پولیس کی ساری نفری حویلی کے ارد گرد پھیل گئی۔ پولیس مستعد تھی۔ رات کے دو بجے اچانک گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں تو اندر حویلی میں بھگدڑ مچ گئی کہ شاید ڈاکو آ گئے ہیں سب باہر کی طرف بھاگے۔ اتنے میں مہمان خانے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔

دو سائے باہر نکلے۔

"سٹور کی طرف سردار"

"چپ"

دوسرے نے ڈانٹا اور دونوں دبے قدموں سٹور کی طرف بڑھنے لگے۔

کافی دیر بعد جب ذرا ہنگامہ کم ہوا اور محی الدین اندر حویلی میں ان کے کمرے کے پاس سے گزرے تو ایک

شخص نے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

"کیا بات ہے تھانے دار صاحب کیا منگو کے آدمی تھے۔ یہ باہر گولیاں کیسی چل رہی تھیں۔

"شاید وہی تھے لیکن بھاگ گئے ہو سکتا ہے پھر پلٹ کر آئیں۔"

کسی مدد کی تو ضرورت نہیں صاحب میرا آدمی اچھا نشانہ باز ہے۔"

ارے نہیں خان صاحب آپ آرام کریں میرے آدمی چوکس ہیں۔ محی الدین آگے بڑھ گئے اور اس شخص نے دروازہ بند کر لیا۔

صبح دم جب رات کے تھکے ہارے سب سو رہے تھے وہ دونوں باہر نکلے اور چپکے سے پہریداروں اور محی الدین کے آدمیوں سے بچتے بچاتے باہر نکل گئے۔

محی الدین جو رات بھر کا جاگا ہوا تھا اندر بڑے کمرے میں پلنگ پر آنکھیں موندے لیٹا تھا کہ خان گلریز اندر داخل ہوئے۔

غضب ہو گیا تھانے دار صاحب آپ کے ہوتے ہوئے میں لٹ گیا۔ ڈاکو سب کچھ لے گئے۔"

"کیا؟"

محی الدین ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے جناب اندر حویلی میں تو کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکا۔"

"ہو گیا جناب پورا اسٹور خالی پڑا ہے۔"

یہ اندر ہی کا کوئی آدمی ہے خان صاحب باہر سے کوئی اندر نہیں آیا۔ آپ نے کس کس سے ذکر کیا تھا کہ تجوری سے تمام مال نکال کر سٹور میں ڈال دیا ہے۔"

"کسی سے بھی نہیں.....اوہ خدایا"

وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولے۔

"ان دونوں مسافروں سے جو مہمان خانے میں ٹھہرے ہیں۔"

"اوہ"

محی الدین اضطراب کے عالم میں مہمان خانے کی طرف لپکے۔

لیکن کمرا خالی پڑا تھا اور دونوں غائب تھے دیوار پر کوئلے سے موٹا موٹا لکھا تھا۔

"منگو ڈاکو۔"

.....چوٹ ہو گئی خان صاحب"

محی الدین نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔

مگر خیر ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے میں ان کے پیچھے ہی جاتا ہوں۔

"لیکن تھانے دار صاحب اکیلے۔"

"ہاں بھیڑ بھاڑ سے وہ چونک جائیں گے۔ یوں وہ بھی تو اکیلا ہی ہے۔ ایک ہی ساتھی ہے اس کے ساتھ اس بار اس کا طریقہ واردات پہلے سے بہت مختلف ہے۔

محی الدین اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑوں کی سمت چل پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا ہولے ہولے گھوڑے کو دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ کہ اچانک کہیں اوپر سے اس پر ایک جال نما پھندا آ کر پڑا اور پھر وہ اس میں چکڑا ہوا اوپر اٹھتا چلا گیا اب وہ گھنے پتوں اور شاخوں والے ایک درخت کے درمیان معلق تھا۔ تب ہی درخت پر سے کسی نے چھلانگ لگائی تو محی الدین نے دیکھا یہ وہی کل والا اجنبی تھا۔

"کیسے ہو محی الدین"

•

وہ ہنسا

تم منگو ہو"

محی الدین نے اسی طرح جال میں جکڑے جکڑے پوچھا۔

"ہاں"

دیکھو منگو ڈاکے ڈالنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ آج یا کل تم ضرور پکڑے جاؤ گے۔ میں نہیں تو کوئی اور تمہیں پکڑ لے گا لیکن اگر تم اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو تو میں وعدہ کرتا ہوں تمہاری سزا کم کروانے کی کوشش کروں گا۔

"بہت خوب محی الدین صاحب! منگو اپنا راستہ نہیں چھوڑ سکتا۔ آج تک کوئی مائی کا لال ایسا پیدا نہیں ہوا جو منگو سے ہتھیار ڈلوا سکے۔

"دیکھو منگو مجھے پتا ہے تم فطرتاً اچھے آدمی ہو۔ اگر تم وعدہ کرو کہ تم آئندہ ڈاکہ نہیں ڈالو گے تو میں تمہیں گرفتار کئے بغیر واپس چلا جاؤں گا اور تمہیں موقع دوں گا کہ تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ دوسری طرف نکل جاؤ اور رزق حلال کماؤ۔"

یہ فریب کسی اور کو دینا بھائی اس وقت تو تم میرے رحم و کرم پر ہو۔ لیکن میں تمہیں چھوڑتا ہوں چل بے بھالو! صاحب کو احتیاط سے نیچے اتار دے۔"

جال آہستہ آہستہ نیچے آ گیا۔"

دیکھو منگو ایک بار پھر کہتا ہوں یہ غلط راہ ہے جو تم نے اختیار کر رکھی ہے۔"

بس محی الدین صاحب ہم تو چلے آپ یہیں آرام کیجئے آپ کے ساتھی یقیناً آپ کی تلاش میں آئیں گے اور آپ کو آزاد کرا دیں گے۔"

منگو نے قہقہہ لگایا اور گھوڑے دوڑاتے ہوئے محی الدین کی نظروں سے دور ہو گئے۔

جب وہ پہاڑی غاروں میں پہنچے تو سب ساتھی ان کا انتظار کر رہے تھے اسے دیکھتے ہی پہاڑان کے نعرے

سے گونج اٹھے "منگو ڈاکو زندہ باد۔"

جواب میں منگو نے بھی نعرہ لگایا اور گھوڑے سے اتر آیا لیکن گھوڑے سے اترتے ہی اس کی نظر ایک سفید ریش بزرگ پر پڑی جو ایک چٹان پر سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

"یہ کس بزرگ کو پکڑ لائے ہو جاہلو"

اس نے ڈانٹا۔

ہم پکڑ کر نہیں لائے سردار یہ خود ہی راستہ بھٹک کر ادھر آ گئے ہیں۔ ہم نے تو صرف انہیں واپس نہیں جانے دیا۔

"ہوں' واپسی کا مطلب تھا ہمارے ٹھکانے کا دوسروں کو پتا چل جائے۔"

"کیا خیال ہے سردار اس کا خاتمہ کر دوں۔"

"نہیں"

منگو نے جانے کیا سوچ کر کہا اور بزرگ کو سلام کیا۔

"ادھر کیسے آ نکلے بزرگو"

"بس تقدیر لے آئی"

"ادھر آنے کا مطلب جانتے ہیں۔"

"ہاں' موت!"

وہ بڑے سکون سے بولے۔

"ایک صورت اور بھی ہو سکتی ہے کہ آپ کو یہیں قیدی بنا کر رکھ لیا جائے۔ دونوں میں سے کون سی صورت قبول ہے"

"دونوں ہی قابل قبول ہیں جو تمہارا دل چاہے۔"

تو ٹھیک ہے پھر یہیں رہو لیکن کہیں بھاگنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا۔ ویسے کرتے کیا تھے آپ۔"

"سکول میں بچوں کو پڑھاتا تھا۔"

تو ٹھیک ہے پھر ان جاہلوں کو پڑھا دیجئے گا۔"

منگو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا' اور زور سے ہنسا۔

اور یوں بزرگ غار میں ڈاکوؤں کے ساتھ رہ کر انہیں پڑھانے لگے۔ چونکہ ان دنوں سب ڈاکو فارغ تھے منگو بھی اکثر سب کے ساتھ اس بزرگ سے پڑھنے بیٹھ جاتا۔ پہلے تو وہ یونہی بیٹھا تھا لیکن پھر ہولے ہولے اسے اس بزرگ کا درس اچھا لگنے لگا۔ وہ لکھنا پڑھنا سکھانے کے بعد انہیں اسلامی تاریخ کے خاص خاص واقعات سناتے۔ ایک روز وہ بزرگ عبدالقادر جیلانیؒ کا واقعہ سنا رہے تھے کہ بچپن میں ایک بار جب وہ علم حاصل کرنے کے لئے ایک قافلے کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ ڈاکوؤں نے قافلے پر حملہ کر دیا اور سب مال و اسباب

لوٹ لیا۔ عبدالقادر جیلانیؒ جو اس وقت ابھی بچے تھے اور ان کی والدہ نے اشرفیاں ان کے کرتے کے اندر سی دی تھیں اور ڈاکوؤں کو تلاش کے باوجود جب ان کے پاس سے کچھ نہ ملا تو انہوں نے یوں ہی پوچھا۔

لڑکے تمہارے پاس کچھ ہے؟

"جی ہاں"

انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

میرے پاس کچھ اشرفیاں ہیں جنہیں میری والدہ نے کرتے میں سی دیا تھا۔

ڈاکو بہت حیران ہوئے۔

تم نے ہمیں یہ سب کچھ کیوں بتایا۔

اس لئے کہ میری والدہ نے مجھے ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین کی ہے۔

ڈاکو اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے فوراً توبہ کر لی۔

وہ بزرگ واقعہ سنا رہے تھے اور منگو کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے غار میں چلا گیا۔ اس نے یونہی شغل کے طور پر ان بزرگ کو پڑھانے کیلئے کہا تھا لیکن ان کے علم نے اس کی کایا پلٹ دی تھی۔ دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر کے اس نے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کیا۔ ساتھیوں کا خیال تھا کہ اب چونکہ پہلی واردات کو بہت عرصہ ہو گیا ہے اس لئے شاید کوئی نئی واردات کرنے کا خیال ہے، لیکن منگو نے ان کی توقع کے خلاف یہ کہا کہ وہ آج سے تائب ہو رہا ہے اور اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دے گا اور سزا کے بعد رزق حلال کما کر کھائے گا۔ تم نے ہر اچھے اور برے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے۔ اب جو جہاں جانا چاہے چلا جائے۔ بہتر تو یہ ہے کہ تم سب غزنی یا بخارا چلے جاؤ پیسہ تمہارے پاس ہے وہاں جا کر کوئی باعزت کاروبار کر لینا۔

"سردار حصہ تو تمہارا ابھی ہے۔ تم بھی ہمارے ساتھ غزنی چلو۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے اپنے دل بھی اب اکتا گئے ہیں اور ہم بھی شرافت کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔"

راجو نے کھڑے ہو کر کہا۔

"نہیں راجو۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے جرائم کی سزا کے بعد ہی نئے سرے سے زندگی کا آغاز کروں گا۔ اور رہا میرا حصہ تو وہ بھی تم آپس میں تقسیم کر لو کہ یہ بزرگ کہتے ہیں، جو دولت ناجائز ذرائع سے حاصل کی جائے حرام ہے۔ میں نئی زندگی کا آغاز رزق حلال سے کرنا چاہتا ہوں۔"

"واہ سردار"

بھالو نے مسخرے پن سے کہا

خود رزق حلال کھاتے ہو اور ہمیں حرام کی تلقین کرتے ہو۔ ہم سب تمہارے ساتھ گرفتاری کے لئے پیش ہوں گے اور سزا بھگتیں گے کہ ہم نے ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔"

منگو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان بزرگ کو پتا چلا تو وہ بے اختیار سجدے میں گر گئے کہ ان کی تعلیم رائیگاں نہیں گئی تھی۔

جب منگو کی قیادت میں سب ڈاکو تھانے پہنچے تو محی الدین حیرت سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہم اپنی گرفتاری پیش کرنے آئے ہیں تھانے دار صاحب۔"

منگو نے ہاتھ آگے بڑھا دیئے"

"لیجئے ہتھکڑی ڈال دیجئے۔"

محی الدین صاحب حیرت سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ منگو جس سے سارا علاقہ خوف کھاتا تھا جسے کسی بھی قسم کا لالچ آج تک ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہیں کر سکا تھا وہ خود چل کر ان کے پاس آ گیا تھا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

"یہ فیصلہ تم نے کیسے کیا منگو"

بڑی دیر بعد انہوں نے پوچھا

یہ سب علم کی روشنی ہے تھانے دار صاحب ایک نیک دل بزرگ نے ہمیں علم دیا اور اس علم نے ہمیں شعور دیا ہمیں نیکی اور بدی" بھلائی اور برائی میں فرق سمجھایا اور صراط مستقیم کی طرف ہماری رہنمائی کی۔

منگو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی..... اس نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ لیکن محی الدین نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالنے کے بجائے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور کہا "منگو! اگر ڈاکو اپنی مرضی اور خوش دلی سے توبہ کر لے تو اسلامی قانون اسے گرفتار کرنے کا نہیں معاف کرنے کا حکم دیتا ہے۔" پھر محی الدین نے آگے بڑھ کر منگو کو گلے لگا لیا اور اسے اچھی زندگی گزارنے کے عزم پر مبارکباد دی۔